ہفت روزہ
الفتح
کراچی



۱۹ اکتوبر

ریاض شاہد سنسر بورڈ کی پابندیوں سے آزاد ہو گئے

قیمت ۵۰



غزل

سید عبدالحمید عدمؔ

تیرے آنسو نہیں ہیں — موتی ہیں
کیا کبھی — کوئلیں بھی روتی ہیں؟

میٹھے ہونٹوں سے — گر عنایت ہوں
گالیاں — رس کے گھونٹ ہوتی ہیں

ایسی باتیں نہ — کیجئے ہم سے
دل میں جو — سوئیاں چبھوتی ہیں

محنتیں — مدّتوں کے کام کے بعد
صرف اک دو گھڑی ہی — ہوتی ہیں

سر کھپاتے چلو — وطن والو
شہد کی مکّھیاں بھی — سوتی ہیں؟

میرا اخلاص — کھوٹا تانبا ہے
آپ کے مکر — سچّے موتی ہیں

میں ہی — حد سے زیادہ بزدل ہوں
وہ تو کچھ مہربان — ہوتی ہیں

زہر ہیں وہ سیاستیں — جو عدمؔ
بغض و نفرت کے بیج — بوتی ہیں!

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد — ۳ شمارہ — ۲۲

۱۲ — ۱۹، اکتوبر ۱۹۷۲ء

نگران

شوکت صدیقی

مدیر

ارشاد راؤ

نائب مدیر

وہاب صدیقی

سالانہ ششماہی

۵۰ پیسے ۲۵ روپے ۱۳ روپے

ہوائی ڈاک سے: ۵۰ پیسے ۳۰ روپے ۱۶ روپے

بحرین، کویت: ۶۰ فلس دوبئی، قطر: ۵ درم

سعودی عرب: ۵ قرش۔ انگلستان ۲ شلنگ ۶ پنس

مقام اشاعت

ہفت روزہ الفتح ۸، ڈی نرسری کمرشل ایریا

پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس۔ کراچی ۲۹

ایڈیٹر پبلشر:- ارشاد راؤ

مطبع حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد کراچی

ٹیلیفون: ۴۱۲۲۷۴

اداریہ

مزدور، کسان، طلبہ محاذ

صوبہ سندھ میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت نے ایک بار پھر مزدوروں اور ان کے رہنماؤں کی گرفتاریاں شروع کر دی ہیں۔ ان میں زیب تن ٹیکسٹائل ملز یونین کے صدر باور خان، اسی ملز کے بخت روان، متحدہ مزدور فیڈریشن کے کرامت علی اور حبیب الرحمان کی گرفتاریاں عمل میں آ چکی ہیں۔ تاہم سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا اور مزید مزدوروں اور ان کے رہنماؤں کی گرفتاریاں متوقع ہیں۔

یہ گرفتاریاں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی روشنی میں مزدور تحریک میں کام کرنے والوں کو حالات کا تجزیہ کر کے آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کرنے میں ذرا برابر بھی دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ ہمارے نزدیک سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ اور نیم نوآبادیاتی نظام میں حکمران طبقے سے اس کے لئے کوئی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ طبقاتی رشتوں کا خیال رکھے گا۔ جب کبھی عمل کا وقت آئے گا تو طبقات کھل کر ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے اور متحارب قوتوں کی حیثیت سے نبرد آزما ہوں گے۔ اس کا ثبوت اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ حکومت نے زیب تن ٹیکسٹائل ملز کے سیٹھ وسیم کو صنعتی تعلقات کے آرڈی ننس کے تحت گرفتار کیا اور یہ الزام قابلِ ضمانت ہے۔ جب کہ یونین کے صدر باور خان کو ڈیفنس آف پاکستان رولز اور ان کے ساتھیوں کو تعزیرات پاکستان کی دفعات ۱۵۱، ۱۱۷ کے تحت پابند سلاسل کیا گیا ہے۔ حکومت بخوبی آگاہ ہے کہ زیب تن کے مزدوروں نے انتہائی صبر و تحمل سے کام لیا۔ وہ کبھی اشتعال انگیزی کا شکار نہیں ہوئے۔ آٹھ آٹھ ماہ کی تنخواہوں کی وصولی کے لئے صنعتی امن کو خطرے میں نہیں ڈالا اور ہر ممکن کوشش کی کہ حکومت انہیں قانونی واجبات دلوانے کے لئے اپنے اقتدار کو منوائے۔

مزدوروں نے موجودہ حالات میں جس سیاسی شعور کا مظاہرہ کیا وہ سرمایہ داروں کے لئے مزید خطرناک بن گیا ہے۔ سرمایہ دار اور نوکر شاہی چاہتی تھی کہ آٹھ آٹھ ماہ تک جن مزدوروں کو تنخواہیں نہیں ملیں گی وہ مزدور سڑکوں پر نکل آئیں گے۔ ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اس طرح نوکر شاہی اور سرمایہ دار صنعتی امن کو درہم برہم کرنے میں نہ صرف کامیاب ہو جائیں گے بلکہ اس کی آڑ میں مزدور تحریک کو کچل کر رکھ دیں گے۔ پھر عوام کو یہ تاثر دینے میں کامیابی حاصل ہو جائے گی کہ "ملک دشمن عناصر" بھارت کے اشارے پر ملکی معیشت کو تباہ کرنا چاہتے تھے۔ نوکر شاہی کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ ملکی سالمیت، معاشی استحکام اور عوام کی خوش حالی کے لئے شرپسندوں کا قلع قمع کر دے۔

سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا تو اب یہ کارروائی شروع ہوئی ہے۔ اس کا مطلب بھی تصادم کے لئے مزدوروں کو مجبور کرنا ہے، اشتعال دلانا ہے اور پھر ہم سے مزید شہید چوک تعمیر کروانا ہے —— ہمیں اس سے ہوشیار رہنا ہے۔ اب مزدوروں کے شہید چوک تعمیر کرنے کی بجائے سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کے قبرستان کی جانب مارچ کرنے کا وقت ہے لہٰذا ——

مزدوروں، کسانوں اور طالب علموں کا عظیم تر متحدہ محاذ قائم کیا جائے۔ ٹریڈ یونین میں کام کرنے والے سرحد کے کسانوں سے رابطہ قائم کریں۔ طالب علم، مزدوروں اور کسانوں سے رشتے مضبوط کریں۔ جب تک سرحد کے کسان کے خون پر کراچی کا مزدور آواز بلند نہیں کرے گا، جب تک کراچی کے مزدوروں کے خون پر جھل جاؤ کا کسان نہیں للکارے گا اور جب تک طالب علموں پر مظالم کے خلاف مزدور اور کسان علم بلند نہیں کریں گے، اس وقت تک حالات پر قابو نہیں پایا جا سکے گا۔ یہ دور روٹی، کپڑے اور مکان کی

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

زنداں سے — اپنے بچّے کے نام

زنداں کی سلاخوں کے پیچھے جب یادوں کے کنول مہکتے ہیں تو شاعر پورب سے چلنے والی ہواؤں کو اپنے بیٹے کے نام ایک پیغام دیتا ہے۔ وہ خوش ہے کہ اس کا بیٹا آزادی کی مشعل اٹھائے تیزی سے اس کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ وہ اُسے مفلسوں اور سبک سروں کی بیداری کے گیت گانے کی تلقین کرتا ہے۔ ہتھیار اٹھائے بغیر انقلاب کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ آزادی کا سایہ آگ اگلتی بندوقوں کے گیتوں سے جنم لیتا ہے۔

عزیز اکبر انڈونیشیا کے مشہور شاعر ہیں۔ آزادی اور انقلاب کا نعرہ بلند کرنے کے جرم میں انہیں پابند سلاسل کر دیا گیا تو انہوں نے سقراط اور منصور کی روایات کو زندہ رکھا۔ جب زنداں کی کوٹھڑی میں نئے دن کا سورج اپنی کرنیں بکھیرتا ہے تو اسے سب سے پہلے اپنے ان ہم وطنوں کا خیال آتا ہے جو آزادی کے پرچم کو اپنے سینے سے لگائے اپنے سروں کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں۔ ان میں اس کا نوعمر بیٹا بھی شامل ہے جس کا دل انقلاب کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے (ادارہ)

عزیز اکبر

جب مزاحمت کا دن طلوع ہوا
میراپی اور بحت بارسین کی ڈھلانوں پر پہلی گولی کی آواز گونجی
تو میں نے پہلی بار سنا میرے بچّے، کہ تم گا سکتے ہو
آہ، میرے بچّے
میری باہیں تجھے سینے سے لگانے کے لئے تڑپ رہی ہیں
لیکن زنداں کی سلاخیں میرے اور تیرے درمیان دیوار بن گئی ہیں



گاؤ میرے بچّے، اپنا سر اوپر اٹھاؤ
ہم مفلسوں اور سبک سروں کی بیداری کے گیت گاؤ
اس یقین کے ساتھ کہ تمہارا سُرخ دل
انقلاب کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے
ہماری ہڈیاں پگھل چکی ہیں، ہمارا بدن زخموں سے چُور ہے
لیکن ہم اپنی پارٹی کا کوئی راز ظاہر نہیں کریں گے
ہمارے منہ سے ایک بھی آہ نہیں نکلے گی

وہ میری چھاتی میں ایک گولی اتار سکتے ہیں
میرے ناخنوں میں زہریلی کیلیں ٹھونک سکتے ہیں
اسے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا میرے بچّے
یہ زندگی کا حسن ہے کہ کوئی اپنے گیت کو سمفنی کا درجہ دیدے
انقلاب ہر چیز کی قربانی چاہتا ہے۔
اور ہم ہر چیز کی قربانی دینے کو تیار ہیں
ہم نے یہ بے بہا سبق سیکھا ہے کہ
ہتھیار اٹھائے بغیر انقلاب نہیں لایا جا سکتا



گاؤ میرے بچّے، اپنا سر اوپر اٹھاؤ
اپنے آنسوؤں کا دھارا، اپنے دل کی طرف بہنے دو
اور دنیا کے کونے کونے میں اپنے گیتوں کی خوشبو بکھیر دو
جہاں جہاں عوام انقلاب کا بیج بو رہے ہیں
ایک دن جب سورج تمتما رہا ہو
ہمیں آگ اُگلتی بندوقوں کے گیت سنانا
جو آزادی کا سایہ لے کر آئیں گی

احوالِ واقعی

عظیم دوست چین کی

یومِ انقلاب کی تقریبات میں

پاکستان کا وفد کیوں نہ جا سکا۔؟

سینما گھروں میں صدر بھٹو کی تصویر پر نہیں

جنرل ٹکا خان

کی تصویر پر تالیاں بجتی ہیں

حکومت اور اپوزیشن چند شخصیتوں کے درمیان کشمکش کا نام ہے

واقفِ حال

جنگ کے دوران بھارت کی قید میں چلے جانے والے ضعیف پاکستانی مرد عورتیں اور کم سن بچے —— آج کل اپنے وطن لوٹ رہے ہیں۔ جب میں ان کی فلمیں ٹیلی ویژن یا سینما گھروں میں دیکھتا ہوں تو آنکھیں نم ہو جاتی ہیں کہ یہ غریب اور ضعیف، جن کا یحییٰ خان کی سازشوں میں کوئی حصہ تھا اور نہ اقتدار میں کوئی حصہ تھا۔ انہیں معلوم بھی نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے کیا ہونے والا ہے —— اقتدار کی کشمکش کسی اور کی تھی مگر اس کشمکش کے نتیجے میں جو مصائب ٹوٹے وہ ان کے حصے میں آئے۔ آٹھ نو مہینے تک بھارت کی جیلوں اور قید خانوں میں اذیتیں سہ کر وہ اپنے وطن لوٹ رہے ہیں —— اس حقیقت سے بے خبر کہ آئندہ ان کے ساتھ کیا گزرے گی؟

یہ ایک دفعہ کی بات نہیں، ہمیشہ غریب عوام پر ہی آفتیں ٹوٹتی ہیں۔ کشمکش چند شخصیتوں کے درمیان ہوتی ہے جو ہمیشہ محفوظ رہتی ہیں —— اور قیامتیں نہتے عوام پر گزرتی ہیں۔ اس وقت بھی یہی کچھ ہو رہا ہے حکمران پارٹی کی عہدیدار شخصیتیں آپس میں برسرِ پیکار ہیں۔ ذاتی چپقلش ذاتی ناراضگیاں اور باہمی اختلافات کی بناء پر استعفوں کا سلسلہ چل رہا ہے۔ لیکن ان ذاتی اختلافات کی بناء پر جو خلاء اور بحران پیدا ہو رہے ہیں۔ ان کا اثر عوام پر پڑ رہا ہے۔ عوام مہنگائی بے روزگاری اور غیر یقینی صورتِ حال سے سخت پریشان ہیں قیمتوں میں کوئی کمی نہیں ہو رہی ہے۔ بلکہ روزانہ بڑھ رہی ہیں۔ روزگار کے مواقع محدود ہو رہے ہیں۔ حکمران پارٹیاں آپس میں کھینچا تانی میں مصروف ہیں۔ وہ صرف اپنی تشہیر کے سامان فراہم کرنے کے لیے نعرے بلند کر رہی ہیں، پالیسیوں کا ڈھونگ رچا رہی ہیں۔ انتخابی مہم کی سی فضا ہے اور بے چارے عوام پس رہے ہیں —— پسے جا رہے ہیں۔

پاکستان کے قیام سے لے کر اب تک یہی معمول رہا کہ اقتدار چند شخصیتوں کے قبضے میں رہا۔ ان کا آپس میں تصادم رہا دستہ کشی رہی گھوم پھر کر وہی چند لوگ حکمران رہے۔ عوام ہمیشہ کسی نہ کسی تحریک میں یہ سوچ کر ان کے ساتھ چلتے رہے کہ اب کے انقلاب آ جائے گا۔ اور ہمارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ حکمران ٹولے دراصل عوام کو استعمال کرتے رہے جب بھی عوام میں اپنے حقوق کا شعور تیز ہونے لگتا، اقتدار پرستوں میں سے کوئی آگے آ کر جمہوریت، عوام کی سربلندی اور وطن کے استحکام کا نعرہ بلند کر کے عوام کو اپنے پیچھے لگا لیتا۔ عوام ایک بار پھر بیوقوف بن جاتے۔ اقتدار پرستوں نے نعروں کا بازار بھی اس لیے گرم رکھا کہ عوام اپنے بنیادی مسائل کی طرف توجہ ہی نہ دینے پائیں —— عوام کو مذہبی تحریکوں حالات میں الجھایا گیا، صوبائی تحریکوں کا شکار بنایا گیا۔ اس سے بھی آگے پہنچے تو بھارت کے خلاف جنگ بھی چھیڑ دی گئی تاکہ عوام کی توجہ ادھر ہی مبذول رہے۔ نتیجہ یہ کہ بنیادیں مضبوط ہونے ہی نہیں دی گئیں، وہ کھوکھلی ہوتی رہیں اور اوپر شاندار محل تعمیر ہوتے رہے۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں عوام نے پارٹی کے منشوروں کو ووٹ دیئے —— عوامی حکومت کے قیام کے لیے! بہت سی پرانی شخصیتیں زمین بوس ہو گئیں۔ لیکن جب عوامی حکومت قائم ہو گئی تو رفتہ رفتہ پھر وہی شخصیتوں کا تصادم شروع ہو گیا۔ پیپلز پارٹی تو نظر ہی نہیں آتی کہ وہ کہاں ہے؟ —— پیپلز پارٹی کی حکومت اور پالیسیاں —— اوپر کی چند شخصیتوں کے درمیان ہی گھومتی رہتی ہیں۔ پیپلز پارٹی کی سنٹرل کمیٹی اور کارکنوں کو کچھ علم نہیں ہوتا کہ کیا ہو رہا ہے —— ؟ عوامی منشور اور عوامی طاقت کے سہارے کامیاب ہونے والی شخصیتیں صدیوں سے کچلے ہوئے عوام کے دکھ درد دور کرنے کے لیے دن رات کام کرنے کی بجائے ذاتی اغراض اور پندار کے جھگڑوں میں مبتلا ہیں۔ اپنے ایئر کنڈیشنڈ دفتروں اور تین ہزار روپے ماہوار کرائے کے ایئر کنڈیشنڈ بنگلوں میں پُر آسائش زندگی گزارتے ہوئے، رنگین محفلوں میں پُر عشرت شامیں گزارتے ہوئے وہ ان پھٹے کپڑوں، بھوک کے پیٹوں، دھنسی ہوئی آنکھوں، دھول میں اٹے ہوئے بالوں والے ہم وطنوں کو بھول گئے ہیں۔ جن کے کندھوں پر چڑھ کر وہ

عوامی وزیر ائیر کنڈیشنڈ بنگلوں اور دفتروں میں جا کر عوام کو بھول گئے ہیں

ان وزارتوں تک پہنچے ہیں ——— لوگ بھوکے ہیں۔ غریب ہیں ——— بے روزگار ہیں ——— کتنی بیٹیاں اپنی مانگ نہیں سجا سکیں ——— کتنے بیٹے تعلیم حاصل کرنے کے باوجود ملازمتوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں ——— وہ یہ بالکل بھول گئے ہیں کہ انہیں اقتدار کن حالات میں ملا ہے۔ ملک کے کیا حالات ہیں۔ ملک کی جغرافیائی سرحدیں خطرے میں ہیں، نظریاتی سرحدیں خطرے میں ہیں، بنیادیں ہل گئی ہیں ——— ایرکنڈیشنڈ دفتر، ایرکنڈیشنڈ بنگلے، ایرکنڈیشنڈ گاڑیاں، ہوائی جہاز دل میں اِدھر سے اُدھر کا سفر ——— نہ ان کے اقتدار کو بچا سکتے ہیں اور نہ ملک کو! ان کے لیے سب سے بڑے مسائل ان کے ذاتی اختلافات ہیں کہ کون کس کے گھر پر چھاپہ مروا رہا ہے، کون کس کی انا کو گزند پہنچا رہا ہے۔

اس پر وزارتیں قائم رکھنا چاہتے ہیں، اس پر وزارتیں چھوڑی جاتی ہیں۔ یہ وزارتیں عوام نے انہیں دی ہیں ——— اور اس لیے کہ وہ عوام کے مسائل حل کریں۔ حکومت ان کے خاندانوں کی جاگیر نہیں ہے کہ وہ آپس میں اس کے چھوڑنے اور رکھنے کا فیصلہ کرتے رہیں۔

انہوں نے حکومت کو "بازیچۂ اطفال" بنا دیا ہے، پورے ملک کو اپنی بازی گاہ بنا دیا ہے ——— انہیں بھیڑوں کی حفاظت کے لیے نگہبانی کا منصب دیا گیا تھا ——— مگر وہ بھیڑیے بن گئے ہیں۔ انہیں یہ بھی سوچنا چاہیئے تھا کہ وہ صرف سندھ اور پنجاب کے حکمران نہیں پورے پاکستان کے حکمران ہیں، پورے پاکستان میں موجود انسانوں کے لیے روٹی کپڑا اور مکان کی ذمہ داری ان پر ہے۔ وہ اپنی رقابتوں اور نزاکتوں میں یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ عوام ان سے اختلافی بیانات نہیں، دستور چاہتے ہیں، روٹی چاہتے ہیں، کپڑا چاہتے ہیں، مکان چاہتے ہیں! اب عوام اتنے بیوقوف نہیں رہے ہیں کہ وہ ان بیانات

انہوں نے حکومت کو

بازیچۂ اطفال

بنا دیا ہے

سے مطمئن ہو جائیں گے ——— قصوری صاحب کو اب ۹ مہینے کے بعد یکایک مہنگائی، زبردستی، ناانصافی سب کچھ کیوں یاد آ گیا۔ گورنر کھر کے ایک بیان نے ان کی انا پارہ پارہ کر دی، صدر بھٹو نے بھی اس انا کو سہارا نہ دیا تو وہ پارلیمانی نظام اور آئین کے بھی چیمپئن بن گئے اور کل تک وہ مارشل لاء کے حامی رہے تھے۔

حکومت کے ارکان میں جو اختلاف ہیں وہ بھی ذاتی نوعیت کے ہیں۔ کسی ایک آدھ وزیر کو چھوڑ کر باقی سب دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے ہیں۔ اس میں کوئی رکاوٹ پیش آتی ہے تو وہ عوامی حقوق کے چیمپئن بن جاتے ہیں۔ اس طرح پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی کے اختلافات بھی شخصیتی اختلافات ہیں اصولی اختلافات نہیں ہیں۔ اقتدار میں شرکت کا مطالبہ پورا ہو جائے تو انہیں کوئی اختلاف نہیں ہوگا دائیں بازو کے رہنما بھی شخصی اختلافات پر اپنی عمارتیں کھڑی کر رہے ہیں۔ اصغر خان اس کی واضح مثال ہیں انہوں نے سب سے پہلے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا نعرہ بلند کیا تھا، اب اس کے مخالف ہیں۔ ان کو اقتدار مل جائے تو سب ٹھیک ہے۔

یہ حقیقتاً احوالِ واقعی ہیں ——— "حکومت" "اپوزیشن" سب شخصی مفادات اور اختلافات کا ڈرامہ ہے۔ عوام کے حقوق اور مفادات کسی کے پیشِ نظر نہیں ہیں۔ ——— چلتے چلتے ایک انکشاف بھی سن لیں کہ ہمارے عظیم دوست ملک چین کے یومِ انقلاب کی تقریبات میں اب کے ہمارا کوئی وفد نہیں گیا ہے حالانکہ ساری دنیا جانتی ہے کہ چین کا سب سے بڑا دوست پاکستان ہے۔ اس کی وجہ بھی شخصی اختلافات ہیں۔ اس وفد کی قیادت وزیر خوراک و زراعت مسٹر غوث بخش رئیسانی کو کرنا تھی۔ پہلے تو اس میں ارکان کی تعداد کا تنازعہ تھا، پھر صدارتی مشیر برائے خوراک و زراعت مسٹر خدا بخش بچہ (ایوبی دور کے شہرت یافتہ) نے بھی متبادل قائد کے طور پر اپنا نام پیش کر دیا۔ کوئی بیس بائیس کے قریب ارکان کی فہرست بنا کر فائل صدر کی خدمت میں پیش کر دی۔

مبینہ طور پر بتایا گیا ہے کہ صدر بھٹو اس سے سخت ناراض ہوئے کہ یہ من مانی کارروائی ٹھیک نہیں ہے۔ اور انہوں نے پھر کسی بھی وفد کو جانے کی اجازت نہیں دی۔ شخصی اختلافات کی بناء پر لیں ہم اپنے عظیم دوست ملک چین کی تقریبات میں اپنی نمائندگی کے لیے کوئی وفد نہ بھیج سکے۔ یہ کتنی شرم کی بات ہے۔ لیکن جب شخصیتوں کے درمیان ہی حکومت چل رہی ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

صدر بھٹو جن عزائم اور اٹل ارادوں کو لے کر برسرِ اقتدار آئے تھے وہ ان کے دوستوں اور ساتھیوں کی رقابتوں، چپقلشوں نے پسِ پشت ڈال دیئے ہیں ان ساتھیوں کی ناز برداری میں صدر بھٹو کو نہ جانے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ ان کی ساری فراست اور تدبر اپنی پارٹی کے اختلافات کو دور کرنے اور اپنے ساتھیوں کو منانے میں صَرف ہو رہی ہے۔ ملکی امور واقعتاً ان کی ذہانت سے محروم ہیں، ملک کے اقتصادی حالات خراب ہو رہے ہیں۔ بین الاقوامی ساکھ گر رہی ہے صدر بھٹو کبھی لاہور جاتے ہیں اور کبھی کراچی، کبھی اپنے چچا زاد کی بوئی ہوئی فصل کاٹتے ہیں اور کبھی اپنے جانشین کی۔!!

اگر یہی حال رہا تو ——— "کارِ طفلاں خواہد شد"

باقی صـ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں





ظالم خان نے ایک بچّے کو ٹریکٹر کے نیچے کچل دیا

تقی نایاب

"مالاکنڈ ایجنسی کے موضع غنی ڈیری میں کسانوں اور خوانین کے درمیان زبردست مسلح جھڑپیں، فریقین نے تقریباً ساٹھ گھنٹے تک فائرنگ جاری رکھی۔ پندرہ افراد ہلاک اور تقریباً اتنے ہی زخمی ہو چکے ہیں۔ یہ لڑائی بڑھتے بڑھتے درگئی سخاکوٹ، گڑھی عثمان خیل، موسیٰ میانہ اور خار گئی تک پھیل گئی ہے۔ ایک طرف سے اس لڑائی میں خوانین، ان کے مسلح غنڈوں ملیشیا، لیوی، پختون زلمے اور ملّا مفتی محمود کے چمچوں نے کسانوں کے گھروں پر بھاری اسلحہ مشین گنوں اور سٹین گنوں سے گولیوں کی بارش کی اور چھوٹی توپوں سے گولہ باری کی جس کے نتیجے میں کسانوں کو اپنے گاؤں چھوڑنے پڑے۔ مکان تباہ ہو گئے اور فصلیں اجڑ گئیں۔ دوسری طرف سے جارسدّہ تنگی مالاکنڈ ایجنسی، لوند خوڑ، گنداخ اور مردان کے چار ہزار مسلح کسانوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اپنا دفاع کیا۔"

پاکستان کے عوام اکثر اخباروں میں اس قسم کی خبریں پڑھتے ہیں تو ان کے چہروں پر حیرانی و استعجاب کے ملے جلے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں، ہشت نگر، درگئی، مندنی، سخاکوٹ ہاتھیاں اور غنی ڈیری ان کے سامنے سوالیہ نشان بن جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں، آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ پاکستان رہے گا بھی یا نہیں یہ یقیناً قیامت کے آثار ہیں۔ لیکن اگر ہم ان واقعات کو پاکستان میں طبقاتی جدوجہد اور عوامی تحریکات کی تاریخ سے جوڑ کر دیکھیں تو ہماری آنکھوں سے اندھیرے کے پردے ہٹ جائیں گے اور حقیقت حال کھل کر سامنے آجائے گی اور ہمیں ہمارے سوالوں کا صحیح جواب مل جائے گا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزوں سے قبل ہمارے آباؤ اجداد ویران زمینوں کو آباد کر کے ساجے کی کھیتی باڑی کرتے تھے لیکن جب انگریزوں نے اس ملک کی دولت کو لوٹنا شروع کیا تو یہاں کا تمام معاشی ڈھانچہ الٹ کر رکھ دیا۔ خود کفیل زرعی معیشت کو تباہ کر کے اسے اپنی سامراجی ضرورتوں کے مطابق ڈھال



لیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے ۱۹۰۰ء کے دوران "بندوبست اراضی" کے نام پر رائج شدہ کھیتی باڑی سسٹم ختم کر کے بڑی بڑی جاگیرداریاں قائم کر دیں اور اپنے مقامی چمچوں عوام دشمن غداروں کو ان جاگیروں کا مالک و مختار بنا دیا جو یہاں کے کسانوں کو بزور طاقت انگریزوں کی تابعداری اور غلامی پر مجبور کرتے رہے ——— اس تمام جائزے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ بڑی بڑی جاگیروں اور جاگیرداروں کا وجود قطعی ناجائز ہے۔ کیونکہ یہ غیر ملکی سامراج کی سازش، ناانصافی، زبردستی اور بدمعاشی کی پیداوار ہیں ——— بس یہیں سے وطنِ عزیز میں جاگیردارانہ تشدد کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے لیکن یہ تاریخ جتنی پرانی ہے مظلوموں کی جدوجہد کی داستان بھی اتنی ہی طویل ہے اور اس جدوجہد کے سب سے بہادر ہیرو سرحد کے غیور کسان ہیں جنہوں نے بیرونی لٹیروں، انگریزوں کو اپنے ملک سے ذلیل کر کے بھگایا اور مادرِ وطن کو آزاد کرایا۔

لیکن ——— یہ آزادی گھناؤنی ہوئی تھی کیونکہ انگریز تو یہاں سے چلے گئے مگر ان کا قائم کیا ہوا لوٹ کا نظام جوں کا توں قائم رہا۔ وطن کے بہادر عوام سے غداری اور انگریزوں کی چمچہ گیری سے حاصل کی ہوئی جاگیریں اور جاگیردار اسی طرح عوام پر مسلّط رہے۔ انہوں نے اپنے آقاؤں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کسانوں کی فصلوں پر قبضے کیے، زبردستی بے گار لی، کھلیانوں اور مکانوں کو نذرِ آتش کر کے بدخلیاں کیں۔ محنت کشوں کی دن رات کی کمائی سے دولت کے انبار لگا کر دنیا کی تمام نعمتوں کا لطف اٹھایا اور اس کے بدلے کسانوں کو بھوک افلاس، فاقہ کشی، تنگ دستی، بے روزگاری اور بے دخلی جیسی لعنتوں کا تحفہ ملا۔

یہ تھی کسانوں کے معاشی استحصال کی شکل!

زمین پر اپنی ناجائز ملکیت برقرار رکھنے کے لیے کسانوں کی گردن پر ذلیل حاکموں کی ایک پوری فوج مال افسر تحصیلدار پٹواری اور تھانیدار وغیرہ کی شکل میں مسلّط کر دی جو کسانوں سے بھاری بھرکم ٹیکس اور رشوتیں وصول کرتے، کاغذات میں ردّ و بدل کے ذریعے خرد برد کرتے، انکار کی صورت میں کسانوں کو پولیس، تھانیدار کے بہیمانہ جبر و تشدد اور وحشت و بربریت کا شکار ہونا پڑتا۔ اور یوں کسانوں کے حاکم بھی وہی بن بیٹھے جو زمینوں کے مالک تھے۔ یہ تھی کسانوں کے (ریاستی اقتدار کے ذریعے) سیاسی استحصال کی شکل!

سرحد کے کسان خوانین کے خلاف ہر محاذ پر لڑنے کو تیار ہیں

کسانوں کو تعلیم سے دور رکھا، ان کی عزتِ نفس کو ختم کر دیا کسان عورتوں سے زبردستی گھروں میں کام لیا جاتا رہا۔ کسان، جاگیرداروں کا حقہ چلم تازہ کرتے رہے اور جاگیردار غیر ملکی شرابیں پی کر برسرِ عام ان کی بہو بیٹیوں کی عصمتیں لوٹتے رہے۔ گالیاں، مار پیٹ، چوری اغوا، جھوٹے مقدمات، قتل و غارت گری جیسی سماجی برائیاں ان کا مقدر بنا دی گئیں۔

یہ تھی کسانوں کے سماجی استحصال کی شکل!

پاکستان کے تمام کسانوں پر ظلم ان میں سے کسی نہ کسی شکل میں ہر وقت موجود رہا اور سرحد کے کسان بھی اس کا بُری طرح شکار رہے ہے۔ لاکھوں انسان آج بھی وہاں فاقہ کشی کی زندگی گزار رہے ہیں اور ان پر مظالم کی فہرست بہت ہی طویل ہے۔

خان قیوم کے دَور میں کسانوں پر جاگیردار حکمرانوں کا جو عتاب نازل ہُوا اس کی داستانیں سنانے کے لیے اب بھی کئی کسان زندہ ہیں۔ بعد ازاں ایوب خان کی آمریت کے زمانے میں ۲۰ ہزار کسانوں کو بے دخل کر کے بے روزگاری اور فاقہ کشی کے مُنہ میں دھکیل دیا اور ۶۵ کسان لیڈروں کو گرفتار کر کے تین تین سال کی سزائیں دی گئیں پھر جب بہادر کسانوں نے پاکستان بھر کے عوام کے ساتھ مِل کر ایوب خان کا تختہ الٹ دیا تو جاگیرداروں کی حفاظت کے لیے فوج میدان میں اتر آئی اور پاکستان کے عوام پر ظلم و ستم کا نیا باب کھلا۔ صُوبہ سرحد میں یحییٰ شاہی نے فوجی جبر کے سہارے منڈی، تنگی اور مفتی آباد میں کسانوں کو عریاں کر کے زدوکوب کیا۔ بہادر کسانوں کی عدم موجودگی میں ان کے مکانوں کو نذرِ آتش کر دیا اور بعض کسان خواتین کو اتنا مارا پیٹا کہ وہ لہولہان ہو گئیں۔ الیکشن کے زمانے میں کئی جاگیرداروں نے اپنے مزارعین کو صرف اس لیے گولیوں سے چھلنی کر دیا کہ وہ ان کی سیاسی بالادستی کے لیے دوٹ کیوں نہیں دیتے۔ ایک معصوم بچے کو ٹریکٹر سے کچل دیا اور ۳ جولائی ۱۹۷۱ء کو منڈی کے مقام پر جاگیرداروں، ان کے غنڈوں، پولیس، لیوی، اور ملیشیا —— نے مِل کر انسانی خون سے ہولی کھیلی۔ رات کے اندھیرے میں کسانوں کو گھیرے میں لے کر ان پر گولیوں کی بارش کر دی اور اتنی بے دردی سے قتلِ عام کیا کہ ظلم کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ گیارہ مرد اور دو عورتیں شہید ہو گئیں۔ اور صِرف اس پر ہی صبر نہیں کیا گیا بلکہ تین ہزار کسانوں کو گرفتار کر کے جیل کی "تنگ و تاریک کوٹھڑیوں" میں دھکیل دیا اور انیس ہزار افراد پر جھوٹے مقدمات قائم کیے۔ جناب افضل بنگش کو بیماری کے عالم میں بھی جیل میں "سی کلاس" دی گئی۔ اور میجر اسحاق کو لاہور کے شاہی قلعے میں نظر بند رکھا گیا۔



میجر اسحاق محمد



افضل بنگش

اس کے بعد پیپلز پارٹی کی حکومت نے زمامِ اقتدار سنبھالی تو کسانوں کی تحریک کو دبانے کے لیے "عوامی مارشل لاء" نے غریب کسانوں پر بے پناہ مظالم توڑے اور متعدد کسانوں کو گرفتار کر کے سزائیں دیں، جو ابھی تک جیل میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں۔ ایک جاگیردار نے اپنے مزارع کو فائرنگ سے زخمی کر کے اپنے کتّوں کے آگے ڈال دیا جنہوں نے اس مظلوم کسان کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ہلاک کر دیا۔

اس حکومت کے بعد "امن" کا پرچم اڑاتے ہوئے اور جمہوریت کا ڈھول پیٹتی ولی خان اور ملّا دو پیازہ مفتی محمود کی نام نہاد اسلامی حکومت آئی جس کے سایۂ شفقت تلے خوانین کھلے بندوں بندوقوں کا استعمال کر کے امن و جمہوریت کی دھجیاں بکھیر رہے ہیں۔ انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں رہی، جب جی میں آتا ہے، کسان شہید کر دیئے جاتے ہیں، مسجدیں مسمار کر دی جاتی ہیں، عورتوں کی بے حُرمتی کی جاتی ہے فصلیں اجاڑ دی جاتی ہیں اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ۱۵ اگست کو مالاکنڈ کے مقام پر قتل و غارتگری کا بازار گرم کر دیا گیا۔ یہاں کے غریب کسان ابھی تک خوانین، ملیشیا اور پختون زلمے، لیوی اور مفتی کے چمچوں کے نرغے میں ہیں۔ ہیچ مردوں، عورتوں اور بچوں سمیت ۵۰۶ کسانوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا ہے۔ افضل بنگش کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے گئے ہیں۔ میجر اسحاق محمد اور شیر علی باچہ پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

اب آپ ہی بتائیے! کیا کوئی باشعور انسان ظلم کی اس بھیانک شکل کو برداشت کر سکتا ہے۔ بالآخر ان بہادر کسانوں نے، جو زمین کا سینہ چیر کر دُنیا بھر کے لیے رزق مہیّا کرتے ہیں اور جنہوں نے بیرونی لٹیروں اور گورے ڈاکوؤں کو مار بھگایا تھا، اندرونی لٹیروں، انگریز کے ایجنٹوں زمین کے ناجائز قابضوں، جاگیرداروں کے مظالم کے خلاف کسان مزارع، کھیت مزدور اتحاد قائم کر کے ظلم کا جواب دینے کی ٹھان لی ہے۔ یعنی کسانوں کی سامراج دشمن تحریک اپنے جدلی ارتقا کے لحاظ سے جاگیردار دشمن تحریک کی شکل میں اپنا اظہار کرنے لگی ہے۔ کسانوں نے ظلم کی طاغوتی قوتوں کے مقابلے میں اپنی تنظیم قائم کر کے اپنی قوتِ بازو کے بل پر تمام مسائل کو حل کرنے کا تہیّہ کر لیا ہے۔

جب کوئی کِسان بے دخل ہوتا ہے تو کوئی دوسرا کسان اس زمین پر ہَل نہیں چلاتا۔ اوّل تو کوئی جاگیردار کسی کسان کو بے دخل کر ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ کسان اس معاشی قتل کا مِل جل کر مقابلہ کرتے ہیں (مالاکنڈ کی حالیہ لڑائی میں کسان جوق در جوق اسی لیے شامل ہو رہے ہیں اور منڈی میں بھی جو دو عورتیں اور گیارہ کسان مرد شہید ہوئے تھے، وہ اپنے ساتھی مزارعین کے لیے ہی جدوجہد کر رہے تھے جبکہ ان کا اپنا کوئی ذاتی بے دخلی کا مسئلہ نہ تھا) کسان اپنی بٹائی پوری لیتے ہیں۔ انہوں نے جاگیرداروں کو بے گار دینا چھوڑ دیا ہے۔ چھوٹے مالک کسانوں، مزارعین اور کھیت مزدوروں نے آپس میں اتحاد پیدا

زمینوں کے مالک

کسانوں کے

آقا بن گئے



کسانوں پر یہ ظلم کب تک

کرلیا ہے ۔ چھوٹے مالکانِ اراضی اپنی رضامندی اور خوشی سے پارٹی کے فیصلے کے مطابق اپنی زمین کا ایک حصہ بے زمین کسانوں میں تقسیم کر رہے ہیں ۔ کھیت مزدوروں کی اجرتیں بڑھا دی گئی ہیں ۔ اس طرح اس علاقے میں صرف بے دخلی کے خوف سے نجات حاصل ہونے کی صورت میں پیداوار میں بے پناہ اضافہ ہوا ۔ خوشحالی کے آثار ہیں نئی بھٹیاں تعمیر ہو رہی ہیں ، چھوٹے مالک کسان ، مزارعین اور کھیت مزدور جاگیرداروں کی معاشی گرفت سے آزاد ہوتے جا رہے ہیں اور وہ دن دُور نہیں جبکہ زمین کے جائز وارث اپنی زمینوں پر آزادانہ ہل چلائیں گے ۔ یہ تمام کامیابیاں حکومت کی مدد سے نہیں بلکہ پارٹی کی قیادت میں کسانوں کی منظم قوت کے ذریعے حاصل کی گئی ہیں ——— "یہ ہے خود انحصاری سے کام لیتے ہوئے پارٹی کی قیادت میں معاشی استحصال سے آزادی کی طرف کسانوں کے طویل سفر کا آغاز !"

کسانوں نے آپس میں اتنا بھائی چارہ پیدا کر لیا ہے کہ چوپالوں اور ڈیروں پر سے رنجش اور گھٹن کی فضا دُور ہو گئی ہے ۔ انہوں نے آزادی سے سانس لینا سیکھ لیا ہے اور ہر وقت خوشی کا سماں بندھا رہتا ہے گاؤں کی رونق بڑھ گئی ہے ، آپس میں خاندانی قبیلہ داری ، اور دوسری چھوٹی بڑی لڑائیاں ختم کر کے سب بڑے جاگیرداروں کے خلاف صف آرا ہو گئے ہیں ۔ اور فیصلہ کن جدوجہد کی تیاری میں مصروف ہیں ۔ آپس میں کوئی جھگڑا ہو تو پولیس ، عدالت ، وکیل ، پٹواری ، تھانیدار اور نوکر شاہی کے چکر میں پھنسنے کی بجائے وہ مقامی پارٹی کے ذریعے اس کا حل تلاش کرتے ہیں اور پارٹی کے فیصلوں پر بغیر کسی جبر کے رضاکارانہ عمل کرتے ہیں ۔ سرکاری اہل کاروں پٹواری ، تھانیدار کو رشوتیں دینا بند کر دی گئی ہیں اور یوں جاگیرداروں کی ریاستی اقتدار کے ذریعے مسلط کی ہوئی انتظامیہ کو معطل کر کے رکھ دیا ہے ۔ جاگیرداروں کے الیکشنوں کا بائیکاٹ کر کے اپنا ووٹ محفوظ کرنا سیکھ لیا ہے ۔ ظالموں کی سیاسی گرفت سے آزاد ہو کر اپنے انقلابی شعور کی قوت سے عوامی سیاست اور کسان نظم و ضبط کی داغ بیل ڈالی ہے جو کل انہیں حکومت کرتے وقت کام آئے گی ——— "یہ ہے خود انحصاری سے کام لیتے ہوئے پارٹی کی قیادت

سرحد کے کسانوں کی

گردن پر قیوم خان ،

ایوب خان ، یحییٰ خان

اور اب ولی خان

میں سیاسی (ریاستی) جبر سے آزادی کی طرف کسانوں کے طویل سفر کا آغاز ——— !"

کسانوں نے خوانین کے شادی بیاہ ، مذہبی رسوم اور دیگر تقریبات کا سوشل بائیکاٹ کر دیا ہے ، ان کے مُردوں کو دفنانے سے انکار کر دیا ہے ۔ جاگیرداروں کو جھک کر سلام کرنا ، ڈیرے پر حاضری دینا اور نذرانے پیش کرنا بند کر دیئے ہیں ۔ کسان عورتوں نے ان کے گھروں میں کام کاج کرنے سے انکار کر دیا ہے اور اس طرح مرتے ہوئے جاگیرداروں پر ایک اور ضرب لگا کر ان کی سماجی برتری کا بت پاش پاش کر دیا ہے ۔ ——— "یہ ہے خود انحصاری سے کام لیتے ہوئے پارٹی کی قیادت میں سماجی طور پر غلامی سے آزادی کی طرف کسانوں کے طویل سفر کا آغاز ——— !"

آئیے ہم بھی ان کی دوستی کا ہاتھ گرمجوشی سے تھام کر "اپنی مدد آپ" کا عملی مظاہرہ کریں ملکی سطح پر ہونے والی طبقاتی جدوجہد کی جنگ میں پنجاب ، سندھ اور بلوچستان کے محاذ سے ان کا ساتھ اس طرح دیں کہ یہاں طبقاتی جدوجہد کو تیز تر کر دیں کیونکہ اسی طرح سامراجی سازشوں اور بورژوا قومیت کی تکنیک علیحدگی پسندی کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور وطن کے تحفظ کی ضمانت مل سکتی ہے ——— ہمیں صوبہ سرحد کے ان بہادر کسانوں کی رہنمائی حاصل کرنی چاہیئے جن کی پارٹی دغلے پن کی سیاست پر یقین نہیں رکھتی ۔ ایوانوں اور اسمبلیوں میں بیٹھ کر کسانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے والوں پر لعنت بھیجتی ہے اور ہر فیصلہ کھیتوں اور میدانوں میں کرنے کے قائل ہیں ۔ جہاں سے مسائل ابھرتے ہیں اور جہاں سے عوام کی قوت اور دولت کے سرچشمے ابلتے ہیں ——— یہی عوامی جمہوری انقلاب کا صحیح راستہ ہے ۔

تحریک آزادی کے ایک فن کار کی برسی



آرٹس کونسل کا اعتراض





تحریک۔ مذہبی ہو کہ سوشل خدا گواہ — قائد مزے میں رہتا ہے پبلک ہراس میں
لیڈر میں اور قوم میں یہ فرق ہے ضرور — ہم لاٹھیوں کی زد میں ہیں وہ اے کلاس میں

سمیع دہلوی کی قلمیں چھوٹی کیوں تھیں؟

وقائع نویس

۳ راکتوبر کو سمیع دہلوی کی برسی تھی۔

"کون سمیع ؟" آرٹس کونسل کے ارباب اختیار منہ بنا کر پوچھتے ہیں۔ جیسے ان کے حلق میں کوئی تلخ چیز پھنس گئی ہو۔!

"وہی سمیع جو برصغیر کا پہلا کارٹونسٹ تھا جس کے بناتے ہوئے کارٹون فرنگی حکام کے سینوں میں برسوں نشتر زنی کرتے رہے!"

"ہاں کچھ یاد تو آتا ہے، شاید پرانے زمانے کا ذکر ہے!"

"اس نے اپنے عہد کے تقاضوں کو پورا کیا تھا۔ اس نے اپنے کارٹونوں سے ہندوستان کے عوام میں آزادی کا جذبہ بیدار کیا تھا۔"

"ٹھیک ہے، لیکن......!"

وہ موقع پرست نہیں تھا۔ وہ آزادی کے متوالے مولانا محمد علی جوہر کی آنکھوں کا تارا تھا۔ "کامریڈ" میں چھپے ہوئے کارٹون بڑے بڑے لکھنے والوں کے مضامین پر بھاری پڑتے تھے۔ صبح جب "کامریڈ" بازار میں آتا تھا تو فرنگیوں میں ہل چل مچ جاتی تھی۔ وہ خورد بین لگا کر اس کے کارٹونوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ روز مجسٹریٹوں کے سامنے اُس کی پیشیاں ہوتی تھیں لیکن وہ دیوانوں کی طرح اپنے نصب العین سے پیار کرتا تھا مجسٹریٹوں کے کارٹون بنانے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ لوگ مزے لے لے کر اس کے بنائے ہوئے کارٹون دیکھتے تھے اور دوسروں کو دکھاتے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں اُسے آرٹس کا گولڈ میڈل ملا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد وہ اپنے موئے قلم سے سیاسی شعبدہ بازوں کو بے نقاب کرتا رہا۔

"آپ کا ادارہ آرٹس کی نمائندگی کرتا ہے نا؟"

"جی......!" آرٹس کونسل کے شہزادے بوکھلا کر اپنی ٹائی کی گرہ درست کرنے لگتے ہیں۔

سمیع کا جرم کیا تھا۔؟

آرٹس کونسل کا ادارہ سمیع مرحوم کو آرٹسٹ اس لئے نہیں گردانتا کہ ان کی تصویروں میں ایک ایک جسم پر پانچ پانچ آنکھیں نہیں ہوتی تھیں۔ ان کا جرم یہ تھا کہ وہ عورت کو اناناس کی شکل میں نہیں پیش کرتے تھے۔ سیدھے سادے خطوط تھے، سیدھی سادی لکیریں تھیں۔ ان کے کارٹونوں میں وہی ماحول پایا جاتا تھا جو ایک عام انسان اپنی آنکھ سے دیکھتا تھا۔ آرٹس کونسل کے سرپرستوں کو ان کے فن میں کوئی خوبی اس لئے نظر نہیں آتی کہ وہ گدھے کی دُم میں رنگ لگا کر اُسے کینوس پر نہیں بکھیرتے تھے۔ ان کے فن میں تجریدیت نہیں تھی۔ یہی ان کا سب سے بڑا جرم تھا۔ وہ پرانے اسکول کے آرٹسٹ تھے۔ زندگی میں رنگ آمیزی کے قائل نہیں تھے۔ آج کے تجریدیت پسند نقادوں کو تو وہی تصویریں بھاتی ہیں، جنہیں الٹا لٹکا کر پہلے انعام کا مستحق قرار دیا جا سکے۔ وہی آرٹسٹ اُن کے ذوق نظر پر پورے اترتے ہیں جن کی قلمیں بڑھی ہوئی ہوں اور بال شانوں سے نیچے لہرا رہے ہوں، جو جدید طرز کے لباس پہن کر مصنوعی طور پر بے ترتیبی کا تاثر پیدا کر سکتے ہوں اور چبا چبا کر انگریزی بولتے ہوں۔

سمیع مرحوم کی قلمیں بہت چھوٹی تھیں اور بال شانوں سے اوپر رہتے تھے۔ اس لئے وہ آرٹس کونسل کے معیار پر کیسے پورے اتر سکتے ہیں۔ اسی لئے ہر سال ۳ راکتوبر کو سمیع کے پسماندگان خاموشی سے ان کی برسی منا لیتے ہیں اور آرٹ کے نام لیوا کسی نئے تجریدی شاہکار کے آگے کھڑے سر دھنتے رہتے ہیں۔

آرٹس کونسل سے ہمیں کوئی شکایت نہیں کہ اُس نے سمیع کی برسی پر ان کی یاد میں کوئی شام کیوں نہیں منائی۔ ہمیں شکایت تو اُن کے بیٹے انور سمیع سے ہے جو جانتے بوجھتے دیوانوں کی طرح آنکھ بند کئے اپنے والد کی راہ پر چل رہا ہے۔ سیاسی پرچوں کے ٹائٹل بناتا ہے اور خوش ہو لیتا ہے۔

ہمیں اس سے شکایت ہے کہ وہ گدھے کی دم کو رنگ میں لتھیڑ کر اپنے فن کی داد کیوں نہیں حاصل کرتا۔ بالوں کو شانوں تک کیوں نہیں بڑھنے دیتا ہے۔ چبا چبا کر انگریزی کیوں نہیں بولتا۔

پچھلی مثالوں سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ اگر انور سمیع کوئی سبق حاصل نہیں کرتا تو وہ بڑا عاقبت نا اندیش ہے۔

برطانیہ میں بیٹھا ہوا ایک سرمایہ دار ایوب خان کے قصیدے پڑھ رہا ہے

بھٹو لیبر کا ساتھ کیوں دے رہا ہے؟



محمود ہارون

پاکستان سے باہر جانیوالے سرمایہ دار واپس نہیں آئیں گے



جنرل حبیب اللہ

الفتح رپورٹ

گرمی کے دنوں میں پاکستان دوزخ بن جاتا ہے۔

ملوں اور کارخانوں کی چمنیاں سیاہ دھوئیں کے ساتھ آگ اگلنے لگتی ہیں۔ ٹین کی چھتوں کے نیچے کام کرنے والے مزدوروں کے جسم سے پسینے کے سوتے پھوٹ نکلتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ دن بھر اپنے کام میں جٹے رہتے ہیں۔ گرمی ہو یا سردی ان کے معمول میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ البتہ کارخانوں اور ملوں کے مالکان کی زندگی میں یقیناً خوشگوار تبدیلی پیدا ہوتی ہے ــــ یہ تبدیلی روپے کے زور پر پیدا کی جاتی ہے۔ ہمارے یہاں کے اجارہ دار اور سرمایہ دار گرمی کی شدت برداشت نہیں کر سکتے۔ انہیں ایرکنڈیشنڈ کار اور بنگلوں کے اندر بھی گرمی ستاتی ہے ــــ لہٰذا گرمی شروع ہوتے ہی وہ امریکہ، برطانیہ، سوئٹزرلینڈ اور یورپ کے ٹھنڈے مقامات کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں اور جب موسم سرما کی آمد آمد ہوتی ہے تو وہ اپنے بال بچوں سمیت دوبارہ پاکستان لوٹ آتے ہیں۔ ایک غیر ملکی پریس نے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ ہر سال کی طرح اس بار بھی پاکستان کے ۲۲ خاندانوں میں سے کئی خاندان سیر سپاٹے کے لئے بیرون ممالک چلے گئے۔ لیکن انہوں نے ابھی تک واپس آنے کا فیصلہ نہیں کیا۔ ان میں سے بعض سرمایہ داروں نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ "پاکستان میں کاروبار کا مستقبل ڈانواں ڈول ہے۔ حکومت لیبر کا ساتھ دے رہی ہے۔ اس لئے اب انہیں پاکستان میں اپنے کاروبار سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔" اس بات کا سنسنی خیز انکشاف لندن کے فنانشل ٹائمز کے ۱۴ ستمبر ۱۹۷۲ء کے شمارے میں کیا گیا ہے۔

کراچی کے کئی ایک صنعت کار اور تاجر موجودہ حکومت سے اس لئے ناراض اور برہم ہیں کہ ماضی کی طرح انہیں محنت کشوں کے استحصال کی اجازت نہیں دی گئی۔ بجٹ کے اعلان سے قبل انہوں نے حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لئے جان بوجھ کر مزدوروں کی دھڑا دھڑ چھانٹی کر کے صنعتی بے چینی پیدا کرنے کی سازش کی۔ بیشتر ملوں کو بلاوجہ بند کر دیا گیا۔ بے شمار کارخانوں کی لومز اور شفٹوں میں کمی کر کے مزدوروں کی برطرفی کا بہانہ بنایا گیا۔ کراچی کے چند کارخانوں کے مالکان تو یہاں تک کہتے سنے گئے کہ ہم مزدوروں سے کام لئے بغیر انہیں اجرت دینے کے لئے تیار ہیں، مگر کارخانے نہیں چلائیں گے۔"

یہ ساری سازشیں توڑ جوڑ اور دباؤ کے ہتھکنڈے اس لئے استعمال کئے گئے تاکہ سرمایہ داروں کو ہر طرح سے لوٹ کھسوٹ کی اجازت مل جائے اور بجٹ میں سابقہ مراعات حاصل کر لی جائیں، لیکن بجٹ کے اعلان کے بعد ان کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ حکومت نے اپنے طبقاتی کردار کا مظاہرہ کرتے ہوئے جاگیرداروں اور وڈیروں کو بخش دیا اور ٹیکسوں کا سارا بوجھ سرمایہ داروں اور صنعت کاروں پر ڈال دیا۔ سرمایہ داروں کو موجودہ حکومت سے اس بات کی توقع نہ تھی۔ وہ اس خیال میں تھے زیادہ نہیں تو کم از کم انہیں بھی جاگیرداروں اور وڈیروں کے برابر مراعات اور سہولتیں حاصل ہوں گی۔ لیکن سال رواں کے بجٹ نے ان کی ساری ہوا نکال دی اور وہ پچکے ہوئے غبارے کی طرح زمین پر بیٹھ گئے۔ غم و غصے سے تو پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے حکومت کی اس پالیسی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ایک دم سے بگڑ گئے اور انتقاماً سیاسی توڑ جوڑ کے ساتھ ساتھ اپنا کاروبار سمیٹنا اور سرمایہ باہر منتقل کرنا شروع کر دیا۔

ملک میں اب تک جتنے ہنگامے فسادات اور نظم و نسق کی ابتری کے واقعات پیدا ہوئے۔ اس میں سرمایہ داروں، جاگیرداروں، نوکر شاہی اور ان کے ایجنٹ سیاسی رہنماؤں کا زبردست ہاتھ رہا۔ برسر اقتدار جماعت کی کمزوریاں بھی گل کھلانے میں پیچھے نہ رہیں۔ اس سے صنعتی پالیسی سے ناراض سرمایہ داروں نے خوب فائدہ اٹھایا اور نتیجتاً صنعتی پیداوار کا پہیہ جام کر دیا گیا۔ بے چارے مزدور، سرمایہ داروں اور برسر اقتدار جاگیرداروں اور وڈیروں کے جھگڑے میں پس کر رہ گئے۔ انہوں نے طرز مالکان کی انتقامی کارروائیوں کے خلاف آواز اٹھائی تو ملازمتوں سے برطرفی کی صورت میں سزا ملی۔ حکومت کی ناانصافیوں کا گلہ کیا تو پولیس کارروائی کے ذریعہ ان کے سینے کو گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ حکومت نے اس مسئلے پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا کہ اصل میں کون سی طاقتیں ان کے خلاف سازشیں کر رہی ہیں اور انہیں ناکام بنانا چاہتی ہیں۔ بعض وزراء نے تو اس قدر غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا کہ انہوں نے کھلم کھلا مزدوروں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور صنعتی ابتری کی تمام تر ذمہ داری بے چارے مزدوروں کے کندھے پر ڈال دی۔

بعض سرمایہ داروں نے

پاکستان کو ختم کرنے کیلئے ولی خاں سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے

صنعت کار موجودہ حکومت کو کس طرح ناکام بنانا چاہتا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال تو یہ ہے کہ صنعت کاروں کے طبقے میں یہ بات بار بار پھیلائی جا رہی ہے کہ حکومت عنقریب ٹیکسٹائل کو قومی تحویل میں لینے والی ہے۔ چنانچہ صنعت کاروں نے اس صنعت میں سرمایہ لگانا بند کر دیا ہے۔ کراچی کے بعض صنعت کار اپنے اثاثے کوڑیوں کے مول بیچ کر گھر بیٹھ گئے۔ حالانکہ حکومت نے ۲ جنوری کو دس اہم صنعتوں کو قومی تحویل میں لینے کے بعد واضح طور پر اعلان کر دیا تھا کہ اب کسی انڈسٹری کو سرکاری تحویل میں نہیں لیا جائے گا۔ مگر ٹیکسٹائل کے متعلق یہ افواہ آج بھی اسی طرح زندہ ہے۔ حالانکہ جن دس اہم صنعتوں اور بیمہ کمپنیوں کو قومی تحویل میں لیا گیا۔ اس سے قبل ٹیکسٹائل کی صنعت کو قومی تحویل میں لینا چاہئے تھا۔ کیونکہ محنت کشوں کی اکثریت اسی صنعت سے



ولی خان

وابستہ ہے اور اس صنعت میں مزدوروں کا سب سے زیادہ استحصال ہوتا ہے۔

حکومت سے انتقام لینے کے لئے ۲۲ خاندانوں میں چند خاندان تو اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ وہ اپنا صنعتی میدان چھوڑ کر میدان سیاست میں کود پڑے اور سازشیں شروع کر دیں۔ سرمایہ داروں کے مفادات کا تحفظ کرنے والی سیاسی جماعتوں کی امداد کے لئے بنکوں کے منہ کھول دیئے گئے پس پردہ مغربی پاکستان کے انتہا پسند علاقائی لیڈروں کا حوصلہ اس قدر بڑھایا گیا کہ اب ادھر بھی کئی شیخ مجیب الرحمٰن پیدا ہو گئے۔ وہی لب و لہجہ، وہی علیحدگی پسندانہ انداز و رجحانات، صوبائی خود مختاری کوئی بری چیز نہیں۔ مگر ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ اس آغاز کے پیچھے کن لوگوں کی زبانیں بول رہی ہیں۔

مغربی ممالک میں بیٹھے ہوئے صنعت کار پاکستان کے خلاف خوب زہر اگل رہے ہیں۔ برطانیہ میں مقیم ایک پاکستانی صنعت کار نے ایک اخباری نمائندے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

"بھٹو ہمارا دشمن ہے۔ مزدوروں کو چھوٹ دے رکھی ہے۔ جون اور جولائی کے پچاس دنوں میں سے صرف ۲۰ دن میرے کارخانے میں کام ہوا۔ کوئی کہاں تک برداشت کرے۔"

اسی صنعت کار نے ایوب حکومت کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہوئے کہا۔

"اس کا دور ہمارے لئے نیک فال تھا۔ سرمایہ داروں کو جتنی مراعات اور سہولتیں اس کے دور میں ملیں کسی دوسرے عہد میں نہیں ملیں۔ اس کے دور میں بہت سارے صنعت کار کروڑوں اربوں روپے کے مالک بن گئے۔ اب ہمیں پاکستان سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ کیونکہ ایوب خان کے زمانے میں ہم نے اتنا منافع کما لیا کہ اب باہر کے ملکوں میں جائداد بزنس ہے۔ روپیہ پیسہ ہے۔ آرام سے بقیہ زندگی گزار سکتے ہیں۔"

بعض صنعت کار یہ کہتے ہیں کہ ہم بھٹو کے دشمن نہیں ہیں۔ بھٹو کے علاوہ کوئی دوسرا آدمی نظر نہیں آتا جو ملک کو چلا سکے۔ مگر ان میں ایک زبردست خامی ہے، وہ ہمیں زیادہ مراعات دینے کے لئے تیار نظر نہیں آتے۔ اگر وہ ہمیں پہلے ہی کی طرح آزادی دے دیں تو سارے حالات نارمل ہو سکتے ہیں۔

برطانیہ میں بیٹھے ہوئے چند پاکستانی صنعت کار تو کھلے

سرمایہ داروں کو ایئرکنڈیشنڈ بنگلوں میں بھی گرمی ستاتی ہے

بندوں پاکستان کی سالمیت کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ وہ پاکستان کے تنگ دل، سیاسی رہنماؤں کے ساتھ مل کر باہر کے ملکوں میں پاکستان کو بدنام کر رہے ہیں۔ سیاسی طور پر اس کے نتائج برآمد ہونے



اے۔ کے۔ سومار

سرمایہ دار اب مغربی پاکستان

میں شیخ مجیب الرحمٰن

کو جنم دے رہے ہیں

لگے ہیں، اندرا گاندھی شملہ سمجھوتے سے منہ موڑنے لگی ہیں۔ پاک بھارت سرحد بالخصوص کشمیر کی سرحد پر فوجی صورت حال سنگین ہونے لگی ہے۔ بھارتی دفتر خارجہ کے ترجمان صاف الفاظ میں کہنے لگے ہیں کہ جب تک پاکستان بنگلہ دیش تسلیم نہیں کرے گا اس وقت تک پاکستان کے جنگی قیدی واپس نہیں ہوں گے۔"

پاکستان کے اندرونی اور بیرونی حالات خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔ حکومت صنعت کاروں کے سلسلے میں اپنی پالیسی پر نظرثانی کرنے کی بجائے ان سے سمجھوتے بازی کی کوشش کر رہی ہے جس کا لازمی نتیجہ مزید خطرناک حالات کی صورت میں برآمد ہو گا۔ یہ صنعت کار ملک کے وفادار نہیں ہیں۔ ان کا کوئی وطن نہیں ہے اگر خدانخواستہ پاکستان تباہ ہو گیا تو یہ ایران، افغانستان، بھارت برطانیہ اور امریکہ چلے جائیں گے۔ اور عیش و آرام سے زندگی گزاریں گے۔ البتہ ان لوگوں پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ جنہوں نے ایک نئے وطن، نئے معاشرے اور نئی زندگی کی چاہت میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔



پچھلے دنوں سے اخبارات میں یوگنڈا سے ایشیائی باشندوں کے اخراج کی خبروں کا چرچا ہو رہا ہے۔ یوگنڈا کے صدر ایدی امین نے ۴ اگست ۱۹۷۲ء کو برطانوی پاسپورٹ رکھنے والے تقریباً ۵۰ ہزار ایشیائی نژاد لوگوں کو ۹۰ دن کے اندر اندر یوگنڈا سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ ان پر الزام ہے کہ وہ معاشی ترقی کو سبوتاژ کر رہے ہیں خود کو افریقیوں سے برتر اور علیحدہ سمجھتے ہیں۔ غیر قانونی ذرائع سے پیسہ باہر بھیجتے ہیں اور ملکی معیشت کا استحصال کر رہے ہیں

لیکن یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ افریقہ کا معاشی استحصال صرف ایشیائی لوگوں نے نہیں کیا بلکہ بڑے مجرم وہ مغربی ممالک ہیں جو دنیا کے ترقی پذیر ملکوں کا استحصال "معاشی اور تکنیکی امداد اور تعاون" کی آڑ میں کرتے ہیں۔ افریقہ کا برِ اعظم اپنے اندر گوناگوں خصوصیات لئے ہوئے ہے جس نے مغربی ملکوں کی ہوسِ زر گری میں اضافہ کر دیا ہے۔



افریقہ کے استحصال میں

امریکہ، برطانیہ اور فرانس کا ہاتھ

روس معاشی تعاون کی آڑ میں افریقہ میں گل کھلا رہا ہے

ریحانہ ادریس

افریقہ معدنیات اور قدرتی وسائل کے خزانوں سے مالا مال ہے۔ اسی وجہ سے افریقہ کی وسیع و عریض سرزمین طویل عرصے سے کئی سامراجی قوتوں کے درمیان مسابقت، کش مکش اور چشمک کا باعث بنی ہوئی ہے۔ ان میں سے ہر قوت افریقہ کا خام مال کوڑیوں کے مول حاصل کرنا چاہتی ہے اور وہاں اپنی مصنوعات کو کھپانا چاہتی ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد مغربی طاقتوں میں طاقت کا توازن بگڑ جانے کی وجہ سے اس علاقے میں ان کی باہمی کش مکش اور آویزش اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ امریکہ نے پرانے نوآبادیاتی حربے کی جگہ نئے نوآبادیاتی حربے کو اپنی بہترین صلاحیتوں کے ساتھ استعمال کرنے کی کوششیں کیں، تاکہ افریقہ میں اپنی سرگرمیوں میں شدت پیدا کر سکے۔

افریقہ میں برطانیہ اپنے زوال پذیر معاشی اور سیاسی اثر کو ہر لمحہ جائز و ناجائز حربوں سے تقویت پہنچانے کی کوشش کرتا رہا۔ جاپان کی معیشت غیر متوازن رفتار سے بڑھ رہی تھی۔ لہٰذا اس کی حریص نگاہیں بھی افریقہ کے قدرتی ذرائع پر لگی ہوئی تھیں۔

دوسری جنگ عظیم سے پہلے افریقہ میں مغربی جرمنی، اٹلی اور دوسرے مغربی ملکوں کی ایک خاص حیثیت تھی اور آج بھی وہ بڑا اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ روسی ترمیم پسند بھی افریقہ میں بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ داخل ہوتے۔ روس اور امریکہ دونوں کے درمیان افریقہ میں حقِ مداخلت کے لئے مقابلہ ہو رہا ہے۔

۱۹۶۰ء کے شروع میں افریقہ میں امریکہ کی ۹۰۰ ملین ڈالر کی بلاواسطہ نجی سرمایہ کاری تھی۔ اس طرح برطانیہ اور فرانس کے بعد اس کا تیسرا نمبر تھا۔ گذشتہ سالوں میں اس میں اور وسعت ہوئی جس کی وجہ سے ہر سال نجی سرمایہ کاری میں چودہ فی صد کی شرح سے اضافہ ہوا۔ ۱۹۷۱ء کے آخر میں امریکی نجی سرمایہ کاری ۳۵۰۰ ملین ڈالر تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس کو پیچھے چھوڑ کر افریقہ میں سب سے بڑا سرمایہ کار بن گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ افریقہ میں امریکہ کی کل سرمایہ کاری اس رقم سے کہیں زیادہ ہے۔ کیونکہ اس کی بالواسطہ سرمایہ کاری مغربی یورپین کمپنیوں کے نام پر کی جاتی ہے۔

افریقی ملکوں میں قائم شدہ فیکٹریاں، کانیں اور کمپنیاں بہت نفع بخش ہیں۔ انہیں ہر سال اپنے سرمائے پر تقریباً چالیس فی صد منافع حاصل ہوتا ہے۔ امریکہ نے جنوبی افریقہ سے خصوصی فائدہ اٹھایا ہے۔ اس رجعت پسند حکومت سے اس کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ امریکہ نے جنوبی افریقہ کو دیگر افریقی ملکوں میں داخل ہونے کے لئے ایک مورچہ کی حیثیت سے استعمال کیا ہے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ افریقہ میں امریکی نجی سرمایہ کاری کا ۲۵ فی صد حصہ یعنی تقریباً ۸۰۰ ملین ڈالر صرف جنوبی افریقہ میں لگا ہوا ہے۔ یہ دیگر افریقی ملکوں میں لگے ہوئے سرمائے کا سب سے بڑا حصہ ہے۔

امریکہ اور افریقہ کے درمیان تقریباً ۵۰۰ ملین ڈالر کی تجارت ہوتی ہے۔ جو امریکہ اور سارے افریقہ کی تجارت کا ۳۳ فی صد ہے۔

افریقی معدنیات مثلاً ہیرے، لیتھیم، گلوشنیم کوبالٹ وغیرہ پر زیادہ تر امریکی سرمایہ داروں کی اجارہ داری ہے۔ ان میں سے تقریباً تمام مصنوعات امریکہ برآمد کر دی جاتی ہیں۔ امریکی صنعت کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ۲۵ سے ۵۰ فی صد کرومیم، انٹی مونی میگنیز اور ٹنٹالم افریقہ سے درآمد کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ، ربڑ، سونا اور یورینیم کی ایک بڑی مقدار بھی افریقہ سے حاصل کرتا ہے۔

دوسری طرف برطانیہ کی غیر ملکی سرمایہ کاری کا ۲۰ فیصد سرمایہ صرف افریقہ میں لگا ہوا ہے۔ اسے غیر ملکی سرمایہ کاری کے ذریعے حاصل ہونے والے کل منافع کا ۲۷ فی صد صرف افریقہ سے حاصل ہوتا ہے۔ آج کل برطانیہ کے سامنے سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں برطانیہ کو "بڑی طاقت" کی حیثیت سے کس طرح برقرار رکھا جائے۔ اس کے تعلقات اپنی ان افریقی نوآبادیات کے ساتھ قائم ہیں جو آزاد ہو کر دولتِ مشترکہ کے ممبر بن گئے ہیں۔ اس زمانے سے برطانیہ کا اثر و رسوخ ان نوآزاد افریقی ممالک میں اب بھی موجود ہے۔

گذشتہ سالوں افریقہ کی فرانسیسی نوآبادیات نے بھی یکے بعد دیگرے سیاسی آزادی حاصل کر لی ہے۔ لیکن فرانس نے ان

آزاد افریقی ملکوں کے ساتھ فرنچ کمیونٹی کے ذریعے بہت قریبی معاشی رشتے قائم کر رکھے ہیں۔ فرانس نے اپنی کل غیر ملکی سرمایہ کاری کا ۳۲ فی صد سرمایہ صرف افریقہ میں لگا رکھا ہے۔

جاپان بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا ہے۔ اس نے بھی آہستہ آہستہ افریقہ میں اپنے قدم جمانے شروع کئے ہیں۔ اپنی مصنوعات کی فروخت کے ساتھ ساتھ وہ افریقہ کی اہم معدنیات پر خصوصی توجہ دیتا رہا ہے۔ وہ زئیر سے یورینیم، گھانا سے Bauxite مراکش سے سیلیسہ اور حبت اور نائیجیریا سے ٹین بھی حاصل کرے گا۔ اس کا منصوبہ یہ ہے کہ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۹ء تک ہر سال سیرالیون سے ۱۰ ملین ٹن خام لوہا حاصل کیا جائے۔ ۱۹۷۲ء سے وہ زئیر سے ہر سال ۵۰۰۰ ٹن تانبا برآمد کرے گا۔ اس کے علاوہ جاپان جنوبی افریقہ سے ایک بڑی مقدار میں خام لوہا بھی حاصل کر رہا ہے۔ اور اب اس کی برآمدی فہرست میں کوئلہ بھی شامل ہو جائے گا۔

فرانس نے افریقہ میں غیر ملکی سرمایہ کاری کا ۳۲ فی صد حصہ لگا رکھا ہے۔

معاشی میدان میں مغربی جرمنی اور اٹلی بھی افریقہ میں امریکہ برطانیہ، فرانس اور جاپان کے حریف ہیں۔

اس وقت جب کہ مغرب کی نئی اور پرانی سامراجی طاقتوں میں افریقہ پر معاشی غلبہ کے لئے کشمکش اور جدوجہد ہو رہی ہے۔ روسی ترمیم پسند بھی جب اور جیسے ہی موقع ملتا ہے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ نئے آزاد افریقی ممالک میں "قومی آزادی کی جدوجہد" کا ٹھپہ لگا کر اور "معاشی تعاون" کی آڑ میں اس براعظم کے اندرونی معاملات میں اپنی ٹانگ اڑاتے ہیں۔ مصر کے علاوہ ۲۰۰۰ ملین ڈالر کی "روسی امداد" دوسرے افریقی ملکوں کو دی گئی اور ۲۰ افریقی ملکوں سے "معاشی اور تیکنیکی تعاون کے معاہدوں" کے ذریعے روس نے اپنی مشینیں افریقہ میں کھپانے اور اس براعظم سے بہت بڑی مقدار میں خام مال حاصل کرنے کے لئے بہت محنت کی ہے۔

افریقہ ایشیا کی طرح عرصے سے ان حریص مغربی اجارہ دار جتھے اور سوشل سامراج کی معاشی لوٹ کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ لیکن اب افریقی عوام ان کی اس لوٹ کھسوٹ، معاشی استحصال اور تسلط کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کرنے کے لئے طویل اور بھرپور جنگ لڑ رہے ہیں اور وہ یقیناً یکے بعد دیگرے فتح سے ہمکنار ہوں گے۔ وہ دن ضرور آئے گا جب افریقہ کی تمام قدرتی دولت اپنے اصلی حق دار، افریقی عوام کے ہاتھوں میں آجائیگی۔

مثالؔ رضوی

غزل

اپنے حالات پہ قادر کبھی انساں نہ ہوا
آج تک اس سے علاجِ غمِ دوراں نہ ہوا

اور بھی بڑھتی رہی سوزشِ بے تابیٔ دل!
چارہ سازوں سے مرے درد کا درماں نہ ہوا

خوفِ برق بھی ہے خطرۂ صیاد بھی ہے
اپنی قسمت کہ گلستاں بھی گلستاں نہ ہوا

موسمِ گل میں بھی پھولوں کی جگہ خار ملے
پر مجھے شکوۂ کوتاہیٔ داماں نہ ہوا

بارہا میں تری محفل میں گیا ہوں لیکن
تجھ سے ملنے کا مگر کوئی بھی امکاں نہ ہوا

کاٹ لی دل ہی جلا کر شبِ ہجراں ہم نے
نہ سہی گر تری محفل میں چراغاں نہ ہوا!

وائے تقدیر کہ جب آئی گلستاں میں بہار
ہاتھ آزاد ہوئے گر تو گریباں نہ ہوا

عمر بھر اشک بہے ہیں مری آنکھوں سے مثالؔ
خشک اک روز بھی یہ دیدۂ گریاں نہ ہوا

سفرنامہ

چین (۳)



احفاظ الرحمان

یہاں کا طلسمی لفظ 'عمل' ہے

'پاچیتھان چنکوھاؤ پھنت گیو'

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد چینی عام طور پر قیلولہ کرتے ہیں۔ یہ ان کی بہت پرانی عادت ہے۔ عجیب منظر ہوتا ہے جس کو جہاں جگہ ملتی ہے وہیں دراز ہو جاتا ہے۔

چنانچہ دوپہر کے کھانے ——— اور قیلولے کے بعد ہم "نوجوان سرنگ" دیکھنے گئے۔ اس سرنگ کی کھدائی میں تین سو نوجوان عورتوں اور مردوں نے حصہ لیا تھا، اس لیے اسے "نوجوان سرنگ" کا نام دیا گیا ہے۔ وانگ ژوچی نامی ایک نوجوان نے جو جونیئر مڈل اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد یہاں منتظم کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ اس سرنگ کے بارے میں ہمیں بہت سی باتیں بتائیں شروع میں چونکہ سارا کام ہاتھوں سے ہوتا تھا اس لیے دن بھر میں مشکل سے تین چار انچ کھدائی ہو سکتی تھی۔ بعد میں جب بارود بننے لگا تو بلاسٹنگ کے ذریعے ہر روز دو میٹر تک کھدائی ہونے لگی۔ لیکن یہ رفتار بھی بہت سست تھی۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے انہوں نے اوپر سے پانچ کنوئیں کھود کر بیک وقت بارہ جگہ سے کام شروع کر دیا۔ اس طرح کام کی رفتار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ اور بہت جلد یہ سرنگ مکمل ہو گئی۔

یہ سرنگ نہ بنائی جاتی تو نہر کی لمبائی میں پانچ لی کا اضافہ ہو جاتا۔ پہاڑوں کے کنارے راستہ بہت ٹیڑھا میڑھا سا تھا۔ پانچ لی کا فاصلہ بڑھ جاتا تو نہر کی کھدائی میں وقت بھی زیادہ صرف ہوتا۔

ہم نے کار سے اتر کر پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ ناہموار سی پگڈنڈی تھی، کہیں کہیں مستطیل نما پتھروں کی سیڑھیاں بھی بنی ہوئی تھیں۔ وانگ ژوچی ہماری رہنمائی کر رہا تھا اور بار بار مجھ سے پوچھ رہا تھا ——— "آپ تھک تو نہیں گئے، ذرا آرام کر لیجئے!" میں کہیں نہیں رکا۔ انہوں نے دس سال کے دوران ہزاروں بار کوہ پیمائی کا یہ مرحلہ طے کیا ہو گا۔ میں ان پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں صرف سو فٹ کی چڑھائی طے کرنے کے بعد ہی تھک گیا تھا ———!

اوپر سے بہت خوبصورت منظر نظر آتا ہے۔ نیچے دائیں طرف دریائے یوشوئے بہتا ہے جس کے دوسری طرف صوبہ شانسی کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ پہاڑ سبزے سے ڈھکے ہوئے ہیں مشرق کی طرف اونچائی سے ایک چھوٹی سی آبشار گرتی ہے۔ شمال مشرق کی طرف بہت سے کسان سرخ رنگ کے پتھروں پر ہتھوڑے چلا رہے تھے۔ اور ان کے بچے پانی میں چھپا چھپ ہاتھ پاؤں چلا رہے تھے۔

ہم اوپر پہنچ چکے تھے۔ یہاں نہر پہاڑ کے کنارے گزرتی ہے۔ دائیں طرف گہرے کھڈ ہیں اس لیے وہاں لوہے کی ریلنگ لگا دی گئی ہیں۔ ریلنگ کے ساتھ ساتھ ایک چوڑی سی دیوار ہے جس پر بیک وقت دو افراد چل سکتے ہیں۔ بہت نیچے دریائے یوشوئے میں بڑی بڑی سی چٹانیں پڑی ہوئی تھیں معلوم ہوا جب بارود سے بلاسٹنگ کی جاتی تھی تو بہت سے بڑے بڑے پتھر لڑھک کر نیچے دریائے یوشوئے میں گر جاتے تھے۔ یہاں سرخ رنگ کی چٹانوں پر کسانوں نے جگہ جگہ مختلف نعرے لکھ رکھے تھے۔

"پرولتاری آمریت کی عظیم فتح زندہ باد"

"صدر ماؤ زندہ باد"

"سختیوں اور مشکلات سے خائف نہ ہو"

چلتے چلتے ایک جگہ نہر کا پانی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یہ "نوجوان سرنگ" کا دہانہ تھا۔ اوپر سرخ رنگ کے جلی حروف میں سرنگ کا نام اور اس کی تکمیل کی تاریخ لکھی ہوئی تھی۔ ہم بڑی دیر تک دہانے کے پاس کھڑے باتیں کرتے رہے۔

میں نے وانگ ژوچی سے سوال کیا ——— "اس سرنگ کی کھدائی کے دوران بہت سے حادثات پیش آئے ہوں گے؟"

"چھوٹے موٹے حادثات تو روزانہ پیش آتے تھے جب سرنگ کے اندر بلاسٹنگ کی جاتی تھی تو بہت سے افراد زخمی ہو





چینی "فرہاد" پہاڑوں کا سینہ چیر کر نہر بنا رہے ہیں۔

اِنسانی عزم کے آگے پتھر موم کی طرح نرم ہو جاتا ہے

جاتے تھے۔ بلاسٹنگ کرنے کے فوراً بعد انہیں رسّوں سے اوپر کھینچ لیا جاتا تھا لیکن اس کے باوجود زہریلے دھوئیں کی وجہ سے کئی بار بہت سے افراد بیہوش ہوئے، بہت سے افراد شدید زخمی ہوئے اور دو افراد شہید بھی ہوئے۔ بعض لوگوں نے دوسروں کی جانیں بچانے کے لیے خود کو خطرات کے سامنے لا کھڑا کیا۔

چالیس پچاس فٹ نیچے ایک چھوٹی سی بیرک نما عمارت بنی ہوئی تھی جس کے سامنے اونچے اونچے پہاڑی درخت لگے ہوئے تھے۔ سُرنگ کے اس حصے کے انتظامی شعبے میں کام کرنے والے کامریڈ اسی عمارت میں رہتے ہیں۔ وانگ ژوچی ہمیں اپنے ساتھ وہاں لے گیا۔ ہم ابھی سیمنٹ کی بنچوں پر بیٹھے ہی تھے کہ چائے سے بھرے ہوئے لمبے لمبے مگ ہمارے سامنے آ گئے۔ وہاں بہت سے اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ چین کے مختلف شہروں سے "سُرخ پرچم" نہر دیکھنے آئے تھے۔

ہم وہاں دیر تک بیٹھے دنیا جہان کی باتیں کرتے رہے۔

نیچے اترتے وقت مَیں نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکا ہتھوڑے سے ایک بہت بڑے پتھر پر ضرب لگا رہا ہے۔ مَیں نے کہا:

—— "مَیں تمہاری تصویر کھینچنا چاہتا ہوں" تو وہ شرما گیا۔ اس کا ساتھی اسے ہدایت دینے لگا کہ ہتھوڑا دھیرے دھیرے چلاؤ۔ میں نے اس کی تصویر کھینچی اور شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔

جھنگ شوئی چھن نے میرا بازو تھامتے ہوئے کہا:

—— "پتھر بہت سخت ہوتا ہے لیکن انسانی عزم کے سامنے موم کی طرح نرم ہو جاتا ہے!"

اس کے اس جملے میں "سُرخ پرچم نہر" کی دس سالہ تاریخ کی صداقتیں جھلک رہی تھیں اور میں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، انکار کیسے کرتا۔ پتھر تو وہیں سخت ہوتا ہے جہاں انسانی ذہن کے اوپر جمی ہوئی تھیوریوں کی گرد اسے عمل سے بے تعلق رکھتی ہے۔

اب چین میں کوئی ماہر، کوئی انجینئر یہ کہنے کی جراُت نہیں کر سکے گا کہ فلاں کام ناممکن ہے۔ یہ "الدین" کا

اُس نے کہا

"ہم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں"

ملک ہے۔ یہاں پہاڑوں کو ہموار کیا جا سکتا ہے، دریاؤں کا منہ موڑا جا سکتا ہے۔ یہاں کا طلسمی لفظ "عمل" ہے۔

واپسی پر ہم ایک چھوٹے سے برقابی اسٹیشن پر گئے یہاں "سرخ پرچم نہر" کا شمال مشرقی حصہ تین شاخوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ پہلی شاخ ۸۳ لی لمبی ہے اور تین کمیونوں کو سیراب کرتی ہے۔ دوسری شاخ بھی جو ۹۶ لی لمبی ہے تین کمیونوں سے گزرتی ہے۔ تیسری شاخ جو سب سے چھوٹی ہے (۲۴ لی)، صرف ایک کمیون کو سیراب کرتی ہے یہاں اس نہر کی گہرائی بارہ میٹر اور چوڑائی آٹھ میٹر ہے۔

اگلے دن ۴ اگست کی صبح کو ہم لنگ شئین کا سب سے بڑا برقابی اسٹیشن دیکھنے گئے۔ اس نہر کی بدولت اب لنگ شئین میں جا بجا بجلی گھر تعمیر ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے صنعت کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔

اس اسٹیشن میں ایک ہزار پانچ سو کلو واٹ کے دو جنریٹر نصب ہیں۔ یہ کام ۱۹۶۶ء میں مکمل ہوا۔ یہ اسٹیشن پوری کاؤنٹی کو بجلی فراہم کرتا ہے اور اس کی لائنیں صوبے کے دوسرے بجلی گھروں سے ملی ہوئی ہیں۔ اس طرح حسبِ ضرورت مختلف علاقوں کو مختلف مقدار میں بجلی فراہم کی جا سکتی ہے۔

اسی دن سہ پہر کے وقت ہم ایک "سُرخ پرچم نہر" کا سب سے بڑا پُل دیکھنے کے لیے گئے۔ اس پل کی لمبائی ۱۳۴ میٹر ہے اور اونچائی ۱۴ میٹر! کُل پچاس محرابیں ہیں۔ ستونوں کی چوڑائی چار میٹر ہے۔ پانی پل کے اوپر سے گزرتا ہے اور یہاں بہاؤ کی رفتار ۲٫۵ کیوبک میٹر فی سیکنڈ ہے۔ یہاں نہر کی تعمیر کا کام دسمبر ۱۹۶۵ء میں شروع ہوا اور اپریل ۱۹۶۶ میں مکمل ہو گیا۔ کل ۱۲۵ دِن لگے۔ پل کی تعمیر میں ۴۹ دن لگے۔ اس حصے میں نہر کی تعمیر میں مقامی کمیون کے تین ہزار افراد نے حصہ لیا تھا۔ روزانہ چھ سو سے زیادہ گدھا گاڑیاں اور دستی گاڑیاں استعمال

کی جاتی تھیں کیونکہ یہاں اینٹیں بنانے کے لیے دور دور تک پتھر نہیں تھے۔ کسانوں کو پتھر لانے کے لیے پانچ لی کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ صرف پل کی تعمیر میں ۲۰۰۰۰ کیوبک میٹر پتھر لگائے گئے۔ پہلے اندازہ تھا کہ اس حصے میں نہر کی تکمیل میں کم از کم تین ماہ لگیں گے۔ کسانوں نے اس چیلنج کو قبول کر لیا اور رات دن سرگرمی سے کام کرنے لگے۔ اسکول کے بچوں نے بھی مقدور بھر ان کی مدد کی۔ کسانوں کے پاس تعمیراتی ساز و سامان کی کمی تھی۔ انہوں نے اپنے وسائل سے سارا سامان جمع کیا۔ پل کی تعمیر کے دوران انہوں نے پتھر اوپر پہنچانے کے لیے دیسی طرز کی لفٹیں بنائیں۔ عورتیں زیادہ تر اینٹیں بنانے کا کام کرتی تھیں بچے پتھر ڈھونے میں نوجوانوں کی مدد کرتے تھے اور دیسی طرز کے معمار اینٹیں چنتے تھے۔

اسکولوں کے بچّوں نے بھی نہر کی تعمیر میں حصّہ لیا

"صبح کی کرن" نے

تنگ کان کمیون میں خوشیوں کا اجالا پھیلا دیا

پانچ بجے ہم "تنگ کان" کمیون میں پہنچے جہاں اس کمیون کے جیالے کسانوں نے چار ہزار میٹر لمبی سرنگ کھود دی ہے۔ اس سرنگ کا نام "صبح کی کرن" ہے۔ یہاں تنگ کان کے ۲۱ بریگیڈوں کے ایک ہزار ایک سو کسانوں نے نہر کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ اس علاقے میں پانی کی شدید قلت تھی۔ پینے کا پانی بھی دس لی کے فاصلے سے آتا تھا۔ کھیت سال بھر خشک رہتے تھے۔ پیداوار کی سطح بہت پست تھی۔ "تنگ کان" کمیون کے کسانوں کو ماضی کی تلخیوں کا شدت سے احساس تھا۔ اس لیے انہوں نے فطرت کی تسخیر کے اس عمل میں



بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہاں نہر کی تعمیر کے دوران سب سے کڑا مرحلہ سرنگ کی کھدائی تھا۔ شروع میں دو طرف سے کام شروع ہوا۔ رفتار بہت سست تھی۔ بعد میں اوپر سے ۳۴ کنویں کھود دیے گئے اور بیک وقت ستر جگہ سے کام شروع کیا گیا۔ سب سے بڑے کنویں کی گہرائی ۶۲ میٹر ہے۔

بارش ہو رہی تھی اور لمحہ بہ لمحہ شدید ہوتی جا رہی تھی چینی دوست اصرار کر رہے تھے کہ ہم واپس لوٹ چلیں لیکن میں ۶۲ میٹر گہرا کنواں ضرور دیکھنا چاہتا تھا۔ ہم بھیگتے ہوئے وہاں پہنچے۔ ہم نے تنکوں کے ہیٹ پہن رکھے تھے ان سے کس حد تک بچاؤ ہوتا۔ کنویں کا منہ مشکل سے تین فٹ چوڑا ہوگا۔ اوپر لکڑی کی چرخی لگی ہوئی تھی جس سے لپٹے ہوئے رسّے سے لٹک کر کسان نیچے اترتے تھے۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا کچھ نظر نہیں آیا۔ اندر پتھر پھینکا تو دیر تک اس کے گرنے کی آواز سنائی نہیں دی۔ "صبح کی کرن" کی کھدائی کا کا کام سوا سال میں مکمل ہوا۔ یہاں پانی کے بہاؤ کی رفتار ۲.۵ کیوبک میٹر فی سکنڈ ہے۔ "صبح کی کرن" نے پورے کمیون میں خوشحالی کا اجالا پھیلا دیا ہے۔ اس نہر کی بدولت اس کمیون کی تیس ہزار مو زمین سیراب ہونے لگی۔

ہم واپس جا رہے تھے کہ میں نے جھنگ شوئے چین سے پوچھا ——— "یہاں بعض کھیت بہت بلندی پر ہیں۔ انہیں تو اس نہر سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا ؟"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا ——— "ایسے کھیتوں کو پمپنگ کے ذریعے سیراب کیا جاتا ہے !"

بارش بہت تیز ہو گئی تھی۔ ہر طرف اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ ہمارا ڈرائیور بہت احتیاط سے کار چلا رہا تھا جگہ جگہ درخت ٹوٹ کر زمین پر گرے ہوئے تھے مکئی کے پودے جھک کر دوہرے ہو گئے تھے۔ بچے باہر نکل کر چہلیں کر رہے تھے۔ ایک جگہ ہماری روسی کار پانی میں ایسی پھنسی کہ ٹھپ ہو کر رہ گئی۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں نے چاروں طرف سے ہمیں گھیر لیا۔ ہر شخص ہمیں اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔

"نی شتڑ نا ئیکو ژرن ؟" (آپ کا تعلق کس ملک سے ہے) ایک ادھیڑ عمر کے کسان نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے پوچھا :—

"پاچیستھان" (پاکستان)

وہ بہت خوش ہوا۔ جب تک کار کھڑی رہی میں اس سے باتیں کرتا رہا۔

"پاچیستھان چنکو ہاؤ پھنگیو" (پاکستان اور چین اچھے دوست ہیں) اس نے بڑی گرمجوشی سے کہا۔

"چین نے پاکستان کی مدد کی ہے، ہم آپ کے بہت شکر گزار ہیں !"

"نہیں، ہم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بچوں نے دھکا لگایا اور گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ سب لوگ گرمجوشی سے میری طرف ہاتھ لہرانے لگے۔

"سائے چین" ! (الوداع)

(باقی آئندہ)

ریاض شاہد بہادر بیباک اور مخلص تھا

حسن عابدی

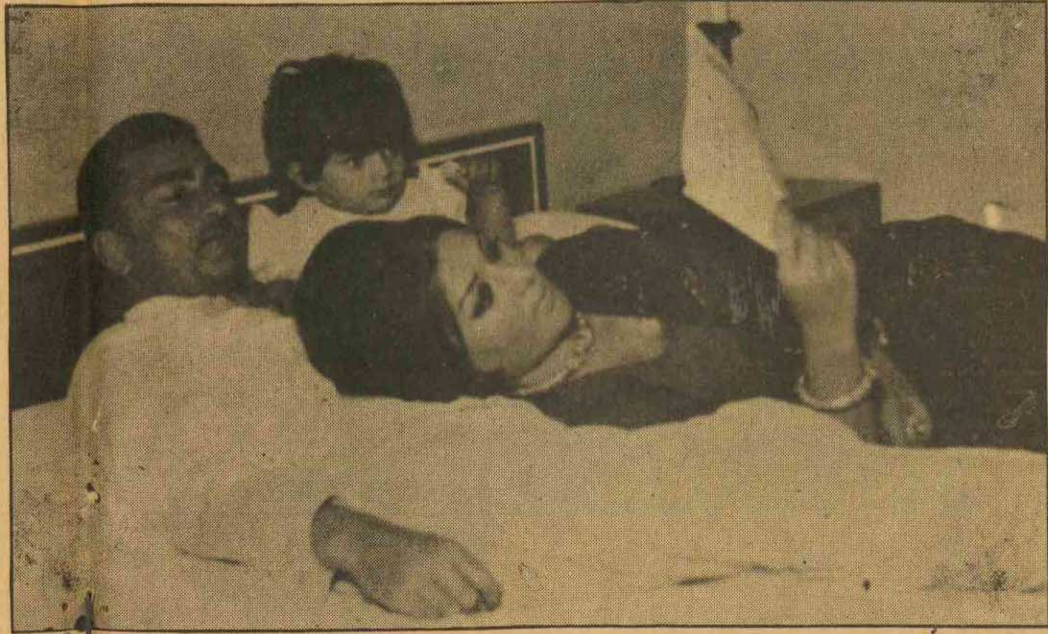
اپنے بارے میں کچھ لکھنا اچھا نہیں لگتا، لیکن جو لوگ میری طرح محتاط ہیں اور اپنا تذکرہ پسند نہیں کرتے، قدرت انہیں بھی زندگی میں ایک موقع فراہم کر دیتی ہے کہ جتنا چاہیں اپنے بارے میں لکھیں اور مرنے والے کو اسی حوالے سے یاد کریں، قدرت کتنی مہربان اور فیاض ہے کہ ایک شخص کو مارتی ہے تاکہ دس یا سو یا ہزار آدمی اس کے نام کے ساتھ اپنا نام لے کر غرور کے ساتھ زندہ رہیں۔

میں یہ نہیں لکھوں گا کہ ریاض شاہد میرا دوست تھا۔ مجھے ریاض شاہد کے قریبی دوستوں سے ڈر لگتا ہے، وہ میرے اس دعوے کی فوراً تردید کر دیں گے۔ کیونکہ پچھلے پندرہ برس میں انہوں نے ایک بار بھی مجھے ریاض شاہد کے ساتھ نہیں دیکھا۔ اس کے باوجود میں اسے دوست رکھتا تھا۔ اور اس نسبت پر اب بھی فخر کرتا ہوں۔

ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے۔ اتوار کو ٹیلیویژن پر کوئی پاکستانی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ میں ذرا دیر سے گھر پہنچا تھا پوچھا کون سی فلم ہے، سب نے بیک زبان کہا "ششش! سسرال ہے"۔ میں اشارہ پا کر چپ ہو رہا۔ "پاکستانی فلمیں عام طور پر جیسی ہوتی ہیں، ہو گی یہ بھی ویسی ہی کوئی فلم" میں نے دل میں سوچا اور اٹھنا چاہتا تھا، لیکن علاؤالدین کی اداکاری اچھی لگی۔ پھر ایک دو سین گوارا سے معلوم ہوئے۔ اب کہانی کا رنگ نکھر رہا تھا۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا "یہ تو ریاض شاہد ہے"۔

اس سے پہلے میں نے ریاض شاہد کی کوئی فلم نہیں دیکھی تھی۔ اس سے میری ملاقات بھی برسوں پہلے اس وقت ہوئی تھی، جب وہ "فلمی زندگی" گزارنے کے لئے گلے مل کر رخصت ہوا تھا۔ آج پندرہ سال بعد فلم "سسرال" میں اچانک اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے ایک ایک منظر اور ایک ایک مکالمے میں ریاض شاہد کو دیکھا اور پہچان لیا۔ وہی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ریاض شاہد کے فن کا اعجاز ہے۔ صاحبِ نظر فنکار اسی کو کہتے ہیں۔ اس کا اسٹائل نمایاں اور منفرد ہوتا ہے۔

یہ کوئی سترہ اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے۔ میکلوڈ روڈ پر ہفت روزہ چٹان کے دفتر کے نیچے غالباً حمید ہاشمی مرحوم نے ایک چھریرے سے نوجوان کے ساتھ میرا تعارف کرایا۔ اس کے چہرے پر زردی، لیکن آنکھوں میں ذہانت



ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

کی چمک نمایاں تھی۔ یہ ریاض شاہد تھے۔ ہمارا سیاسی اور صحافتی علم ان دنوں بھی واجبی سا تھا۔ لیکن ریاض شاہد کو میں نے اپنے آپ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں پایا۔ نوجوانی کا جوش اور جذبہ اس کی گفتگو میں حاوی تھا۔ میں نے اس ملاقات میں اسے بے حد جوشیلا، بلا کا ذہین اور انتہائی باتونی اور ان سب کے سوا بے باک، صاف گو اور مخلص پایا۔ اس نے حال ہی میں چٹان کی ملازمت چھوڑی تھی۔ پھر وہ بتانے لگا کہ میں اپنے آجروں سے پیسے کس طرح وصول کرتا ہوں۔ کتنی بار آستینیں چڑھانی پڑتی ہیں اور تیوریوں پر بل ڈال کر "خوبصورت" گالیوں سے ان کی تواضع کرنی ہوتی ہے۔ انہی دنوں اس کا ناول "ہزار داستان" چھپا تھا۔ تین چار دن بعد ہم ملے تو اس نے وہ ناول مجھے بھی پڑھنے کے لئے دیا۔

ریاض شاہد کی زبان میں تلوار کی کاٹ تھی۔ ہر بات کی دلیل اس کے پاس موجود ہوتی۔ جذباتی اور ضد کا پورا تھا۔ دوستوں کا گہرا دوست اور دشمنوں کا شدید دشمن۔ میں نے اسے کبھی کسی سے ڈرتے ہوئے نہیں دیکھا، بشرطیکہ آدمی بہت نیک سیرت اور شریف نہ ہو۔

وسط جنوری ۱۹۵۷ء میں پروگریسیو پیپرز لمیٹڈ کے زیر اہتمام لیل و نہار کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ فیض احمد فیض صاحب اس کے چیف ایڈیٹر اور سبطِ حسن صاحب ایڈیٹر تھے۔ پرچے کی تیاری کے لئے سب سے پہلے جن لوگوں کا ادارے میں تقرر کیا گیا، ان میں، میرے علاوہ ریاض شاہد اور مشہور کارٹونسٹ زیدی شامل تھے۔ بعد میں کچھ اور لوگ آئے اور آمد و رفت کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ہمارا تقرر دسمبر ۱۹۵۶ء کے اوائل میں ہوا تھا۔ پروگریسیو پیپرز لمیٹڈ کی عمارت میں کھلی چھت پر جہاں آج کل دفاتر بن گئے ہیں۔ فوری ضرورت کے تحت خیمے لگا دیئے گئے، لیکن ہمیں زیادہ دنوں خیمے میں نہیں بیٹھنا پڑا۔ مہینے بھر بعد لیل و نہار کے دفاتر نکلسن روڈ کے ایک فلیٹ میں منتقل کر دیئے گئے۔ اور ۱۹/جنوری ۱۹۵۷ء کا پہلا پرچہ اسی فلیٹ سے شائع ہوا۔ یہاں مجھے ایک اور نام یاد آ رہا ہے، یہ ہمارے دوست حفیظ قندھاری تھے۔ معلوم نہیں ہمارے یہ دوست ان دنوں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں، لیکن یقین ہے کہ جہاں بھی ہوں گے بُرے حال میں ہوں گے۔ حفیظ قندھاری ایک باکمال فوٹوگرافر ہیں۔ لاہور کی پرانی ادبی، افسانوی اور صحافتی زندگی میں ان کا ذکرِ خیر کبھی کبھی اس طرح سنائی دیتا ہے، جیسے الف لیلیٰ کی کہانیوں میں علی بابا کا نام آتا ہے۔ حفیظ قندھاری کی دوست داری، ان کا اخلاص، ان کی صاف گوئی اور ان کی کام چوری، ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے۔ لیل و نہار کے دو تین شمارے شائع ہوئے تھے کہ ایک روز انہیں ایک صوبائی وزیر اور مسلم لیگی رہنما کے جلسے کی تصویر بنانے کے لئے کہا گیا۔ وہ صبح کو گئے اور شام کو گردن جھکائے کاندھے پر کیمرہ لٹکائے، بوجھل قدموں کے ساتھ واپس آ گئے۔ کاپی لیٹ ہو رہی تھی اور ہمارے بے حد صابر ایڈیٹر کا پارہ بھی اس وقت تک انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ ہم میں سے کسی نے آگے بڑھ کر پوچھا، "حفیظ صاحب! وہ تصویر؟"

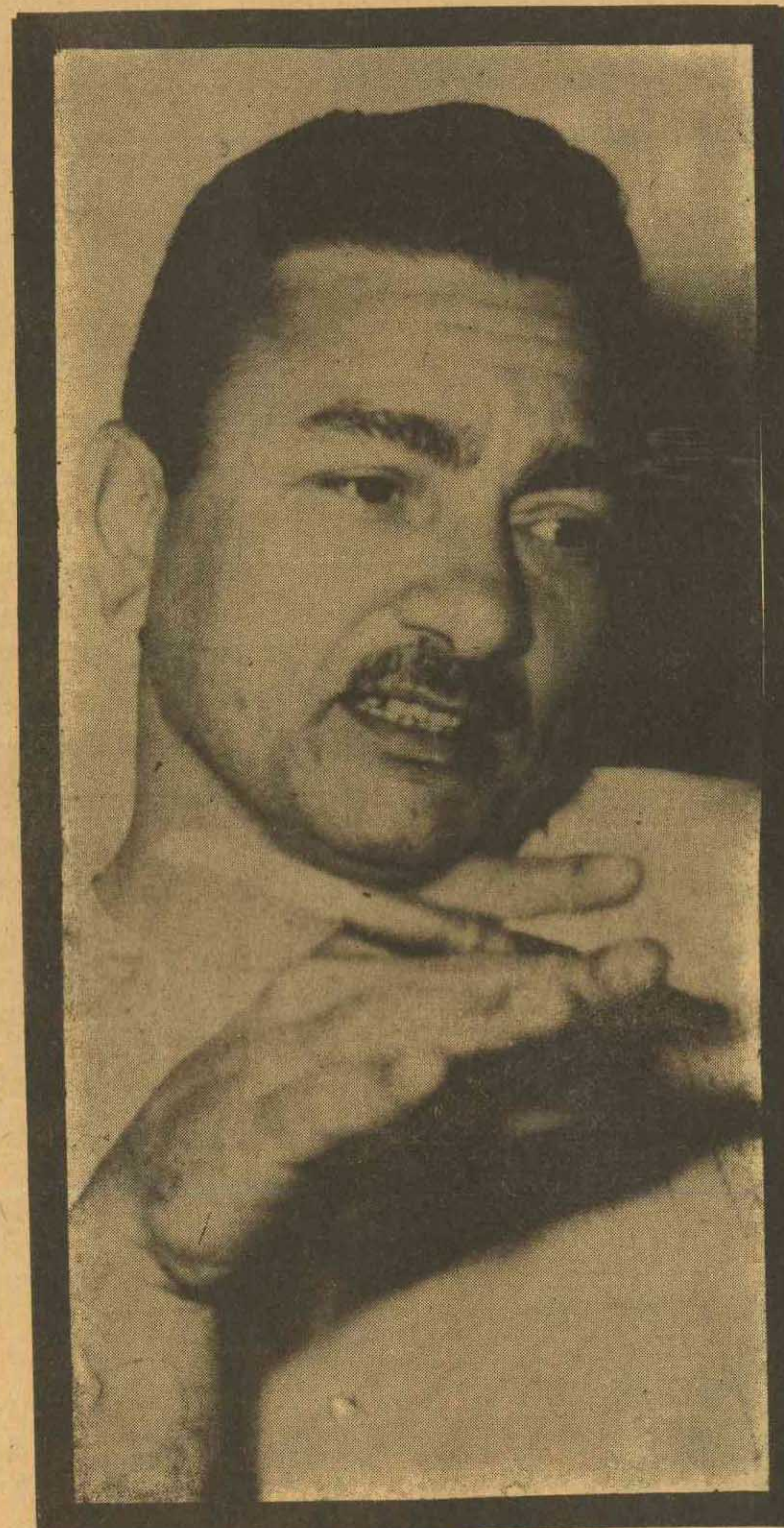
حفیظ صاحب نے چونک کر پوچھا، "کونسی؟"

ہم نے کہا، "فلاں وزیر کی! آپ کیا جلسے میں نہیں گئے تھے؟"

حفیظ صاحب نے بیزاری سے کہا، "میں نے اس کی تصویر نہیں بنائی، بکواس کرتا ہے، سالا"۔ پھر انھوں نے وضاحت کرنی شروع کی کہ انھوں نے اس شخص کو اپنے کیمرے کے لائق کیوں نہیں سمجھا۔ لیکن یہ وضاحت سننے کا حوصلہ اب کس میں تھا۔

بہرحال یہ ایک الگ داستان ہے۔ ذکر ریاض شاہد کا تھا۔ ریاض کو حفیظ سے بڑی محبت تھی۔ وہ ان کی ہر کمزوری کو فراخدلی سے نظرانداز کر دیتا تھا۔ اس وقت مجھے یہ گمان گزرتا تھا کہ حفیظ کی طرح ریاض کو بھی کام سے دلچسپی نہیں۔ لیکن وقت گزرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ ریاض کتنا فراخ دل، انسان دوست اور محبت کرنے والا شخص ہے کام کے معاملے میں ہم نے کبھی اسے سراسیمہ پریشان یا غیر معمولی حد تک "مصروف" نہیں دیکھا۔

ہم میں سے اکثر لوگ اور میں بھی انہیں شامل ہوں جو اخبار میں کام کرتے آئے ہیں، دراصل اتنے "ذمہ دار" نہیں ہوتے، جتنا "احساسِ ذمہ داری" اپنے اوپر طاری رکھتے ہیں، اتنے مصروف نہیں ہوتے، جتنا مصروف خود کو ظاہر کرتے



اُس نے ایک مالک اخبار سے اپنی تنخواہ کیسے وصول کی۔؟

ہیں، اتنے زیر بار نہیں ہوتے، جتنی زیر باری اور دکھائی ان کے چہرے پر لکھی ہوتی ہے۔ ریاض ہم سے بہت مختلف تھا۔ مطمئن، مسرور، شگفتہ، ہلکا پھلکا، جیسے کرنے کے لئے کوئی کام ہی نہیں رہا۔ باتوں میں شوخی اور طراری، زبان ہر وقت کترنی کی طرح چلتی ہوئی۔

ریاض شاہد کے ذمے فیچر لکھنا تھا۔ اس کا گھر موہنی روڈ پر داتا دربار کے عقب میں ہے۔ اس نے اندرون شہر کی تہذیبی زندگی کو محض دیکھا نہیں تھا، اسے گزار کر آیا تھا۔ اس نے فیچر لکھے جو بہت پسند کئے گئے۔ اس کا ایک یادگار فیچر اندرون شہر کے "حمام" کے موضوع پر تھا۔ یہ موضوع اس نے خود منتخب کیا تھا۔ "حمام" اس کے خیال میں ایک پورا ادارہ (INSTITUTION) ہے جہاں لوگ صرف حجامت بنوانے اور نہانے نہیں آتے بلکہ محلے کی سیاست سے لے کر ملک کی سیاست تک اور چھوٹی بڑی خبروں اور واقعوں سے لے کر اسکینڈل تک، نہایت وسیع تنوع موضوعات یہاں زیر بحث آتے ہیں۔ شادی بیاہ، رشتے ناطے، عشق اور اغوا، سبھی کی بازگشت یہاں سنی جاسکتی ہے۔ یہی وہ فیچر تھا جس کے نقوش پندرہ سال بعد بھی میرے ذہن میں باقی تھے۔ اور جب میں نے "سسرال" کے چند سین دیکھے تو بے اختیار پکار اٹھا کہ یہ تو صاف ریاض شاہد ہے، کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔

فیچر کے علاوہ ریاض شاہد کے ذمے فلم کا صفحہ تھا۔ فلم کی خبریں اور تصویریں اکٹھی کرنے اور فلموں پر تبصرے لکھنے کے لئے وہ سارا سارا دن دفتر سے غائب رہتا۔ دلچسپی میں اس کے ساتھ کبھی علاؤالدین، کبھی طالش اور کبھی دونوں ہوتے تھے۔ ریاض اپنا کام بڑی دلچسپی سے کر رہا تھا۔ لکھتے لکھتے جب ترنگ میں آتا تو کہتا کہ "میں اپنی فلم ضرور بناؤں گا۔" انہی دنوں اسے اپنے ناول "ہزار داستان" کو فلم بند کرنے کا خیال آیا تھا۔

ایک روز ریاض شاہد دفتر آیا تو ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہنے لگا "میں اب یہاں سے چھوڑ دوں گا۔" اس کے لہجے میں بیزاری نہیں بلکہ خفت تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اپنے اس ارادے پر وہ نادم ہے اور پوری بات کرتے ہوئے ڈرتا ہے۔ ریاض نے کہا کہ "میں نے فلم میں کام کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ کہانیاں لکھوں گا، مکالمے لکھوں گا۔ کام مل گیا ہے، کچھ اور کام مل جائے گا۔"

میں نے دوستی کا حق ادا کرنا ضروری سمجھا، کہا، "دیکھو تم پریشان ہو گئے۔ فلم والوں کا حال آجکل برا ہے۔ رائل پارک کے تہہ خانے میں اور سستے ہوٹلوں میں بیکار بیٹھے چائے کی ایک ٹھنڈی پیالی اور گرم پانی کے گلاس پر پورا دن گزار دیتے ہیں۔" لیکن ریاض نے کہا، "چھوڑو، یہ باتیں۔ یہ بتاؤ کہ سبطِ صاحب سے کیسے بات کی جائے؟"

میں نے پھر کہا کہ "اچھا تم یہاں بھی کام کرو اور فلم میں بھی۔ جب وہاں ٹھیک طرح پاؤں جما لو تو چلے جانا۔" لیکن ریاض کو یہ تجویز بہت بری لگی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ایک تو اس میں خود اعتمادی بہت ہے، اور اپنی صلاحیتوں پر کامل یقین ہے کہ اسے دھوکہ نہیں دے سکتیں۔ دوسرے چوری اور منافقت سے اسے سخت چڑ ہے۔ بزدلی اور منافقت یہ دو عیب وہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کہنے لگا "میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔" لیکن سبطِ صاحب کے سامنے سچ بولنے کی ہمت بھی اس نے بڑی مشکل سے پیدا کی۔ بہرحال ریاض کے دو جگری دوست علاؤالدین اور طالش جلد ہی اسے ہماری نظروں کے سامنے سے دبوچ کر لے گئے۔

اس کے بعد ریاض سے ہماری ملاقاتیں چار چھ مہینے بعد بس سرراہے ہوتی رہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مالی طور پر مطمئن ہے اور کاروباری طور پر ساکھ والا آدمی ہے۔ اس دوران کئی بار جی چاہا کہ ریاض سے ملاقات کی جائے لیکن فاصلے درمیان تھے، اس کی راہ اور تھی، میری بے راہروی کا میدان اور۔ اب یہ کہنے سے کیا حاصل کہ ہم اور ریاض دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ یہ اس کی فراخدلی تھی کہ پرانے مراسم کا پاس رکھتا تھا۔ اور میری بے پرواہی کہ خواہش کے باوجود اس سے نہ مل سکا۔

اب ریاض کے بارے میں سوچتا ہوں تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری اور اس کی رفاقت کا مختصر عرصہ شاید ہم دونوں کے لئے کافی تھا۔ شاید ہمارے اور اس کے سیاسی خیالات کی ہم آہنگی کا یہ اعجاز تھا، کہ اس دوران میں جب بھی اس کا نام آیا، کچھ اس طرح طمانیت کا احساس ہوا، جیسے ملاقات ہو گئی۔ اسے کیا معلوم کہ میں اس عرصے میں اسے کتنی بار مل چکا ہوں۔ اور ممنونیت اور احسان مندی کے جذبات کے ساتھ اس کی پیشانی کو بوسہ دے چکا ہوں۔

- کراچی کے ۹۰ فیصد عوام طبی سہولت سے محروم ہیں
- بلدیہ کے ہسپتال اور زچہ خانے بدعنوانی کا گڑھ بن گئے
- ڈرگ اسٹورز سے دوائیں غائب کر دی جاتی ہیں۔



اللہ دینو نے تھک ہار کر فٹ پاتھ پر دم توڑ دیا

—— : نعیم الحسن : ——

اللہ دینو ایک عرصہ سے بیمار تھا۔ حکیم، ڈاکٹر اور ویدوں سے علاج کرا کر تھک گیا مگر افاقہ نہ ہوا۔ مرض بڑھتا گیا۔ جوں جوں دوا کی۔ معمولی ہاری تھا، گھر میں جو کچھ تھا اپنے علاج پر لٹا دیا۔ جب کچھ نہیں بچا تو مایوس ہو کر گھر میں بیٹھ رہا۔ بیوی نے آنسو بہائے تو اس نے مایوسی سے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اللہ کی بندی خدا پر بھروسہ رکھ، اگر وہ علاج کا بندوبست نہیں کر سکتا، موت تو دے سکتا ہے۔" انہی دوران کسی ہاری نے اللہ دینو کو مشورہ دیا کہ وہ کراچی چلا جائے "وہاں بڑے بڑے ہسپتال اور مفت شفا خانے ہیں۔ چند ہی مہینوں میں بھلا چنگا ہو کر واپس لوٹے گا۔"

اللہ دینو سادہ لوح ہاری تھا —— دوست کی بات اس کے پلے نہیں پڑی۔ جب اس کا علاج اس کے اپنے آبائی شہر میں نہیں ہو سکتا تو بھلا دوسرے شہر میں کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر اس کی بیوی بضد تھی کہ وہ شہر چلا جائے اور وہاں اپنا علاج کرائے۔ اللہ دینو دو تین دن تک ٹالتا رہا۔ مگر بیوی کی ضد کے سامنے اسے ہتھیار ڈالنا پڑے۔

دوسرے دن سفر خرچ کے لئے کچھ روپے ادھار لے کر وہ کراچی پہنچ گیا اور مسلسل کئی روز تک کراچی کے ہسپتالوں کے چکر کاٹتا رہا۔ مگر اس کے علاج کا کہیں بندوبست نہ ہوا۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملا، "بیڈ خالی نہیں ہے۔" پھر آنا۔ یہ جواب اسے ایک بار نہیں سینکڑوں بار سننے پڑے۔ اس کے پاؤں سوج کر کپا ہو گئے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں۔ اور آنکھیں مزید اندر دھنس گئیں۔ نہ علاج کا بندوبست ہوا اور نہ بیوی کی دعا کا کچھ اثر ہوا۔ پندرہ بیس روز تک خوار ہونے کے بعد ایک خیراتی ہسپتال کے سامنے والے فٹ پاتھ پر تھک ہار کر مر گیا۔

اللہ دینو کی موت کے منظر کو بہت سے لوگوں نے دیکھا اور تاسف کے چند جملے کہنے کے بعد اپنے اپنے کام سے لگ گئے۔ کراچی کے شہریوں کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی کہ یہاں اس قسم کے روزانہ سینکڑوں واقعات ہوتے ہیں۔ اللہ دینو تو نواب شاہ سے علاج کرانے آیا تھا۔ یہاں تو کراچی کی بیشتر آبادی علاج و معالجے کی بنیادی سہولت سے محروم ہے۔ ایک ماہ میں کئی افراد اللہ دینو کی طرح دوا کی حسرت اپنے دل میں لئے فٹ پاتھ کے کسی گوشے میں دم توڑ دیتے ہیں۔

کراچی میں جہاں بے شمار مسائل ہیں۔ وہاں طبی سہولت کا فقدان بھی سنگین مسئلہ بنا ہوا ہے۔ شہر جوں جوں اپنے پاؤں پھیلا رہا ہے۔ شہری آبادی اس مسئلے کے بوجھ تلے دبتی جا رہی ہے حالانکہ کراچی مغربی پاکستان کا واحد شہر ہے جو حکومت کو سب سے زیادہ ٹیکس ادا کرتا ہے۔ حکومت شہریوں کی طبی امداد پر ایک کروڑ ساڑھے چھیاسٹھ لاکھ روپے سالانہ خرچ کرتی ہے۔ اگر کراچی کی آبادی ۵۰ لاکھ تسلیم کی جائے تو ایک محتاط اندازے کے مطابق ہر شہری مرکزی اور صوبائی حکومت کو ٹیکسوں کی صورت میں سالانہ ۵۰۰ روپے ادا کرتا ہے۔ جب کہ ہر شہری کی طبی امداد پر اوسطاً ۳ روپے ۳۳ پیسے سالانہ خرچ کئے جاتے ہیں۔ آمد اور خرچ کے درمیان اتنی بڑی تفاوت بہت مشکل ہی سے کسی دوسری جگہ ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ دو بڑے ہسپتالوں کے علاوہ بلدیہ کے ہسپتالوں، ڈسپنسریوں اور کلینک کے باوجود ہر ماہ کئی مریض طبی امداد حاصل کئے بغیر مر جاتے ہیں۔ ایسی اموات کی تعداد سالانہ سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ کیا آج کی مہذب دنیا میں اس بات کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ کوئی مریض طبی امداد حاصل کئے بغیر شہر کے فٹ پاتھ پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر

ہسپتالوں میں مریضوں کا داخلہ مرض سے نہیں، سفارش سے ہوتا ہے

جان دیدے۔

کراچی میں دو بڑے ہسپتال ہیں۔ جناح میڈیکل ہسپتال اور سول ہسپتال۔ صوبائی حکومت اور محکمہ صحت کی جانب سے سول ہسپتال اور دوسرے طبی اداروں پر سالانہ ۴۰ لاکھ روپے خرچ کئے جاتے ہیں۔ کراچی میونسپل کارپوریشن کی زیر نگرانی چلنے والے چار ہسپتالوں، ۴۴ ڈسپنسریوں، ۱۳ زچہ خانوں، ۳ مدر اینڈ چائلڈ ہیلتھ سنٹر اور ۴ کلینک پر سالانہ ۵۰ لاکھ روپے صرف ہوتے ہیں۔ لانڈھی کورنگی میونسپلٹی کے انتظام میں علیحدہ ایک زچہ خانہ، ۳ یونانی ڈسپنسری، چار ڈسپنسری پر سالانہ ۴ لاکھ روپے خرچ کئے جاتے ہیں۔ جب کہ ڈسٹرکٹ کونسل کے تحت ایک زچہ خانہ اور ۰ ڈسپنسریوں پر سالانہ ساڑھے ۰ لاکھ روپے خرچ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کراچی کنٹونمنٹ بورڈ اور ملیر کنٹونمنٹ بورڈ سالانہ ۵۰ ہزار روپے اور پاکستان ویسٹرن ریلوے اپنے ہسپتالوں پر ڈیڑھ لاکھ روپے خرچ کرتے ہیں۔ ان تمام اخراجات کو جمع کر دیا جائے تو تقریباً ایک کروڑ ۷۰ لاکھ روپے بنتے ہیں۔ اگر اس رقم کو فی کس کے حساب سے تقسیم کیا جائے تو ہر شہری کے حصے میں تین روپے ۳۳ پیسے سالانہ آتے ہیں جب کہ کراچی کا ہر شہری ٹیکسوں کی صورت میں اوسطاً ۵۰۰ روپے سالانہ ادا کرتا ہے۔ اس کے باوجود ہر ماہ اس شہر میں کوئی نہ کوئی غریب مریض دوا کے بغیر مر جاتا ہے۔؟

جناح اور سول ہسپتال میں مریضوں کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہے؟ اس کے بارے میں وقتاً فوقتاً اخبارات میں خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ یہ دونوں ہسپتال مریضوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے مقابلے میں ناکافی ہیں۔ دوسری طرف بد انتظامی اور بدعنوانی کے سبب زیر علاج مریض بھی کسمپرسی کے عالم میں ہیں۔ مریضوں کو سفارش یا رشوت کے ذریعے داخلہ ملتا ہے۔ جن کے پاس سفارش یا رشوت دینے کے لیے رقم نہیں ہوتی وہ ہسپتال کے چکر کاٹ کاٹ کر تھک جاتے ہیں، انہیں داخلہ نہیں ملتا۔ زیادہ غریب اور مجبور مریض بعض اوقات ہسپتال کے سامنے دم توڑ دیتے ہیں۔ اسٹور سے سینکڑوں روپے کی ادویات غائب کر دی جاتی ہیں۔

آؤٹ ڈور مریضوں کو عام پر رنگدار مکسچر اور سر درد کی گولیوں پر ٹرخا دیا جاتا ہے۔ میڈیکل اور سرجیکل وارڈ میں زیر علاج مریض بھی دوا سے زیادہ دعا پر اعتماد کرتے ہیں۔ یہ کراچی شہر کے ان دو بڑے ہسپتالوں کی حالت ہے جنہیں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے علاوہ محکمہ صحت کی جانب سے سالانہ لاکھوں روپے کی امداد ملتی ہے۔

بلدیہ کی زیر نگرانی چلنے والے ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں میں اس سے زیادہ بُرا حال ہے۔ بلدیہ کے درجہ چہارم کے ایک ملازم نے بتایا کہ بلدیہ کے ہسپتال اور ڈسپنسریاں عملاً افسروں، ان کی بیگمات اور بال بچوں کی خدمت کے لیے بنائی گئی ہیں۔ ان کے لیے اسٹور میں ہر وقت قیمتی ادویات موجود ہوتی ہیں جبکہ درجہ سوم اور درجہ چہارم کے ملازمین کے لیے پانی ملے ہوئے مکسچر اور سستی گولیوں کے علاوہ کوئی چیز موجود نہیں ہوتی۔

بلدیہ کے ایک ملازم نے بڑی دردناک کہانی بیان کی۔ اس نے بتایا ــــــــ اس کی بیوی سخت بیمار تھی ڈاکٹر نے بڑی مشکل سے طاقت کی ایک دوائی لکھ کر دی۔ جب وہ نسخہ لے کر اسٹور میں پہنچا تو اسٹور کیپر نے نسخہ واپس کرتے ہوئے بڑی سرد مہری سے جواب دیا ــــــــ "یہ دوا اسٹور میں موجود نہیں ہے بد" اس نے اسٹور کیپر کی بڑی منت سماجت کی، خدا کا واسطہ دیا، انہیں اپنی بیوی کی بیماری کا حوالہ دیا۔ مگر اسٹور کیپر نے ایک ہی جواب دیا کہ ــــــــ "دوا ہے ہی نہیں تو میں کہاں سے پیدا کروں ڈاکٹر سے کوئی دوسری دوا لکھوا کر لے آؤ!"

بلدیہ کے اس ملازم نے اپنا نام ظاہر کرنے سے منع کر دیا۔ اسے اس بات کا بھی خدشہ ہے کہ اگر اس نے اس واقعہ کے ساتھ اپنا نام ظاہر کر دیا تو اس کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔ اس نے بتایا کہ اسی وقت ایک کلاس ون افسر کا چپڑاسی اسٹور میں آیا۔ ڈاکٹر نے افسر کی بیگم کو وہی دوا تجویز کی تھی جو میری بیوی کے لیے لکھ کر دی تھی۔ اسٹور کیپر نے فوراً ایک آدمی کو بازار دوڑایا اور باہر سے دوا منگوا کر افسر بہادر کے چپڑاسی کے حوالے کی۔

بلدیہ کے ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں میں افسروں اور با اثر ملازمین کے علاج معالجہ پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ درجہ سوم اور چہارم کے ملازمین پر کوئی توجہ دینی تو الگ بات رہی انہیں حقارت سے دھتکار دیا جاتا ہے۔ ہسپتال، ڈسپنسری اور کلینک افسر شاہی، بدعنوانی اور بدانتظامی کے شکار ہیں۔ ان میں کام کرنے والے بعض بدعنوان افراد نے تو اپنا گھر بھر لیا ہے۔ علیحدہ سے ڈسپنسری اور میڈیکل اسٹور کھول لیے ہیں۔ لاکھوں روپے کما لیے ہیں، انہیں روکنے ٹوکنے والوں نے بھی کوئلے کی دلالی میں اپنے ہاتھ کالے کر لیے ہیں۔ ہر طرف لوٹ مار اور خرد برد کی دھوم مچی ہے۔ بیچارے بلدیہ کے چھوٹے ملازمین دوا کی بجائے دعا سے اپنا کام چلا رہے ہیں۔

بلدیہ کے ہسپتالوں کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی گئی ہے جس میں ان ہسپتالوں کی کارکردگی پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے انتظامی امور میں گڑبڑ، بدعنوانی اور ڈاکٹروں کی لاپرواہی کے کئی واقعات بیان کیے ہیں۔ رپورٹ میں یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے کہ ان ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں کی کارکردگی کسی طور پر اطمینان بخش تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ علاج کی غرض سے جانے والے درجہ سوم اور چہارم کے ملازمین کی پریشانیوں میں اضافہ ہی ہوتا ہے، کمی نہیں ہوتی۔ ان کی ناقص کارکردگی کے متعلق کئی وجوہات بیان کی گئی ہیں۔

(۱) دوسرے نیم سرکاری محکموں کے برعکس بلدیہ کے ملازمین کی طبی سہولت پر اوسطاً کم رقم مختص کی جاتی ہے۔

(۲) اعلیٰ افسران کا شمار مراعات یافتہ طبقہ میں ہوتا ہے انہیں طبی سہولت سے لے کر دیگر تمام سہولتیں آسانی سے حاصل رہتی ہیں۔ میونسپل ہسپتالوں میں ان کے مریضوں پر خاص توجہ دی جاتی ہے جبکہ درجہ سوم اور چہارم کے ملازمین عدم توجہی کے شکار ہیں۔

(۳) لیڈی ڈاکٹر اور ڈاکٹر اپنی پسند کے ہسپتال اور کلینک میں تبادلہ کرا لیتے ہیں اور سات سات سال سے بھی زیادہ عرصے تک ایک ہی یونٹ میں آرام سے وقت گزارتے ہیں۔ بلدیہ کے ایک زچہ خانے میں ایک لیڈی ڈاکٹر چھ سال سے کام کر رہی ہے۔

(۴) پتہ چلا ہے کہ بلدیہ کے بعض ہسپتال، کلینک اور زچہ خانے میں غیر تربیت یافتہ لوگ رکھے گئے ہیں۔ یہ ایک انتہائی خطرناک رجحان ہے۔ اس قسم کی تقرری عام طور پر سفارش اور اثر و رسوخ کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ یہ اقربا پروری کی انتہائی بدترین مثال ہے جو ہمیں میونسپل ہسپتالوں میں نظر آتی ہے۔

(۵) تربیت یافتہ میڈیکل اسٹاف کو بعض بنیادی حقوق سے محروم رکھا گیا ہے۔ سنیارٹی اور کارکردگی کی بنیاد پر ترقی نہیں دی جاتی اور نہ ہی میڈیکل اسٹاف کو اسپیشل الاؤنس دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹروں کو کار الاؤنس بھی نہیں دیا جاتا جبکہ دوسرے نیم سرکاری محکموں میں کام کرنے والے ڈاکٹروں اور لیڈی ڈاکٹروں کو کار الاؤنس دیا جاتا ہے۔

(۶) کراچی کی آبادی اور میونسپل ملازمین کی تعداد کے مقابلے میں میونسپل ہسپتالوں، زچہ خانوں اور ڈسپنسریوں کی تعداد بہت کم ہے۔

کراچی کے عوام کو طبی سہولت کی بے حد ضرورت ہے۔ ۹۵ فیصد آبادی طبی امداد سے محروم ہے۔ آبادی کے تناسب سے ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں کی تعداد ناکافی

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں



افسانہ : یوسف نازؔ۔ راولپنڈی



ننگے جسموں کی نمائش

اور پھر میں نے احساس کیا ــــ میرے چاروں جانب سایوں کی آہٹ گونج رہی ہے۔ ! سائے جو ہر جانب سے اُمڈ آئے ہیں ــــ اور ان کی آہٹوں کی چاپ ...... کیا میں اندھا ہوں ؟ کیا اندھیرا میری آنکھوں کا نور نگل گیا ہے ؟ میں خود سے سوال کرتا ہوں ! یہ سائے ہیں یا کچھ اور ...... میں اپنے جسم کے خول سے باہر نکل کر اپنے جسم پر پڑے ہوئے بے شمار غلاف اتارتا ہوں ! تب میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ سائے تو میرے جانے پہچانے ہیں۔ وہ قطعی اجنبی نہیں ! میں بالکل ذرا سی آنکھیں کھولتا ہوں ! ...... تو جیسے یہ سائے سائے نہ رہے ہوں بلکہ اب ننگے جسموں میں مدغم ہو گئے ہوں ...... اور فی الواقع یہی ہوا ! ننگے جسموں کا یہ حصار میرے وجود کے گرد بدستور گہرا ہوتا چلا گیا۔ اس وقت میں نے سوچا ...... میں مقید ہو کر رہ گیا ہوں۔ یہ کیسی بستی ہے ؟ میں اپنے اندھے ذہن سے پوچھتا ہوں ؟ حالانکہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ کون سی بستی ہے ...... ننگے لوگوں کی بستی ! ہا ہا ہا ......

ایک اندھا کرخت قہقہہ میرے حلق سے پھوٹ پڑا۔ اور پھر جیسے ننگے جسموں میں مدغم سائے بول اٹھے ...... ہمیں پہچانتے ہو ؟ وہ چلائے ...... ! نہیں ! میں نے بے ساختہ کہا !۔ اس بستی کو جانتے ہو ؟ ان کی چیخوں کا ارتعاش گونج اٹھا ــــ نہیں ! میں پہلے جیسا جواب دیتا ہوں۔ کیا تم خود کو پہچانتے ہو ــــ ایک سسکتی ہوئی صدا گونجی ......

تو میں اپنے جسم کو ڈھونڈنے لگا ! اندھی آنکھیں تاریک ذہن لئے میں نے اپنے جسم سے نہایت مکاری سے پوچھا۔ ہاں تو بتلا کون ہوں میں ؟ مگر جسم نے کوئی جواب نہ دیا جیسے شعلوں کی راکھ دم توڑ گئی ہو ــــ ! میں نیا لبادہ اوڑھ کر خوشامد سے کہتا ہوں۔ میں تمہارے جیسا ہوں ...... بالکل تمہاری مانند ...... ! تم جھوٹ بولتے ہو ! ننگے جسم چلائے تم ہمارے جیسے نہیں ہو ! تمہاری تو آنکھیں بالکل پتھر ہیں اور چہرہ ! پتھر کا ــــ میں لرز اٹھا ...... اور زور سے کہا ...... میں بالکل تمہاری مانند ہوں ــــ بالکل یقیناً

اور پھر یک لخت ایسا ہوا ــــ جیسے مکھیوں کی بھنبھناہٹ ــــ بے ہنگم شور جاگ اٹھا ہو، اور ایک بوسیدہ چہرہ ننگے جسموں کے حصار سے برآمد ہوا ! اس کے چہرے پر بے پناہ سلوٹیں تھیں۔ اس کی آواز لرزی۔ جیسے دیئے کی دم توڑتی ہوئی لَو ...... ! کیا تم ہمارے جیسے ہو ! اس کی زرد نگاہوں میں شک رینگنے لگا ! ہاں ! میں بالکل جھوٹ بول دیتا ہوں۔ تو پھر تم ان چمکیلے غلافوں میں کیوں مقید ہو ! ننگے کیوں نہیں ہو جاتے ــــ ننگے ہو جاؤ ــــ ننگے ہو جاؤ ــــ بوسیدہ چہرہ صدا بن کر گونج اٹھا اور بازگشت بن کر چھا گیا ...... تاریکی کی مانند ــــ میں سمجھ جاتا ہوں کہ میرے جھوٹ کا فریب دم توڑ چکا ہے ــــ مگر میں پھر وار کرتا ہوں "میں تمہارا ہمدرد ہوں سوچو مگر میں ننگا نہیں ہو سکتا ــــ میرے جسم پر صدیوں پرانی تہذیب کی ترقی کے خلاف مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتے ــــ اور پھر سب سے بڑھ کر انسان ہوں۔ اور انسان ...... ننگے جسموں کی تھرتھراہٹ گونج اٹھی ! اگر تم انسان ہو تو ہم کون ہیں ؟ بتلاؤ ! میں بوکھلا جاتا ہوں اور فوراً ہی سوچے سمجھے بغیر کہہ دیتا ہوں۔ تم سائے ہو ...... کالے سائے جنہوں نے ننگے جسموں کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے ! ہو ہو ہو ...... ہا ہا ہا ...... ننگے جسموں سے بھیانک قہقہے پھوٹ پڑے ! تو ثابت ہوا تم ہمارے جیسے نہیں ہو ــــ میں لرز اٹھا اور میرا جھوٹ فریب کا زخم کھا کر مر گیا ــــ میں پیشانی سے پسینہ پونچھتا ہوں اور خوشامد سے ایک چال چلتا ہوں ! میں تمہارے دکھوں کا مداوا کرنا چاہتا ہوں۔ یقین کرو میں تمہارا ہمدرد ہوں خاموش ننگے جسم کراہ اٹھے ...... اگر تم ہمارے ہمدرد ہو تو لاؤ ہمارا صدیوں پرانا خون ہمیں واپس کر دو ...... ! ننگے جسموں سے صداؤں کا سیلاب اُمڈ آیا ...... اور پھر ننگے جسم مجھے اپنے حصار میں لے کر ناچنے لگے ! ...... وحشیانہ طور پر۔ اور پھر دفعتاً وہ خاموش ہو گئے ! جیسے شور مر گیا اور خاموشی نے اس کی لاش اٹھا کر دھند گہرائی میں پھینک دی ہو ! اب میں بالکل پوری آنکھیں کھول دیتا ہوں ...... بالکل پوری ...... اندھیرا مر گیا اور نور کی کرنوں نے میری نگاہوں کے کھنڈر میں جھانکا اور میں نے دیکھا ــــ میری چاروں جانب ننگے جسم ایستادہ تھے ! جیسے قدیم سنگتراشوں کے بُت ــــ اور میں نے چند لمحوں بعد دیکھا کہ ان ننگے جسموں کے بوسیدہ منہ اپنے ہی جسموں کو چاٹ رہے تھے ! میں غور سے دیکھتا ہوں ! تو مجھے بے حد کراہت آتی ہے۔ میں نفرت کے شعلے برساتا ہوں ! کیونکہ وہ اپنے پیپ آلود زخموں کو چاٹ رہے تھے ! ان کے ہونٹوں پر انگلیوں پر زرد سی پیپ بہہ رہی تھی۔ اور تیز بدبُو ... میں لرزتے ہوئے نفرت سے کہتا ہوں ! یہ تم کیا غلیظ کام کر رہے ہو ! کیا کر رہے ہو ! غلیظو ... گندو ــــ بے رحم قاتل ! ننگے جسم چلائے ــــ ہم سے ہمارا خون چھین کر ہم سے پیپ بھی چھیننا چاہتے ہو ــــ کیا اب ہماری ہڈیوں کا سودا کرو گے ...... ادھر دیکھو ! ایک ننگا جسم عورت کے قالب میں ڈھل گیا ــــ میرا بچہ بھوکا ہے۔ اور اب میری چھاتیوں میں پیپ کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے ــــ بتاؤ میں کیا کروں۔ ! میرے بچے کے مردہ ہونٹ پیپ کے لئے ترس رہے ہیں۔ میں پیپ کہاں سے لاؤں جب کہ جسم کا

باقی صـ ۲۶ پر ملاحظہ فرمائیں



ہم لوگ



فلمی دنیا میں انسان بکتے

وہ جوہو کی سڑک کے آخری موڑ پر ہمیشہ کے لئے روپوش ہوگئی۔

ضیاء سرحدی کی یادداشتیں

(۱۶)

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

بمبئی پہنچنے کے بعد، اپنی مرہٹن محبوبہ سے میری پہلی ملاقات جوہو کے مقام پر 'پام گروو' ریستوران میں ہوئی۔ سمندر کے کنارے یہ ایک دور افتادہ، خاموش مقام تھا، جہاں پر اس سے پہلے بھی ہم اکثر آتے رہتے تھے۔

اس ریستوران کے آس پاس کثیر التعداد ناریل کے درخت تھے جو سمندری ہواؤں کی دھن پر اکثر جھومتے رہتے۔ قطار اندر قطار ان حسین درختوں کا لہرانا، اور جھومنا کچھ یوں محسوس ہونے لگتا تھا کہ جیسے فطرت ایک کورس رقص پیش کر رہی ہے۔ کسی نہ کسی وجہ سے ان درختوں میں میرے لئے بڑی کشش تھی، اور میں اکثر ان کے قد و قامت کے حسن اور ترنم میں والہانہ انداز سے کھو جایا کرتا تھا۔ میرے لئے وہ منظر بھی بڑا دلکش ہوتا تھا۔ جب ناریل توڑنے والے مزدور، کمر میں رسیاں باندھ کر، دور اوپر ان درختوں پر چڑھ کر ناریل توڑا کرتے تھے۔ اور میں اپنی دنیائے تصورات میں ساتھ ساتھ کچھ یوں سوچنے لگ جایا کرتا تھا کہ جیسے انسان آسمان کے تارے چن چن کر اپنے ارتقا کی جھولی بھر رہا ہے۔ میں یہ بھی سوچا کرتا تھا۔ کہ یہ مضمون فلم کے جمالیاتی زاویوں کے لحاظ سے بھی کس قدر موزوں اور قابل نگاہ ہے۔ میں اکثر ان ناریل توڑنے والے مزدوروں سے باتیں بھی کیا کرتا تھا۔ اور ان محنت کشوں کی غم انگیز داستانیں سن سن کر بے چین بھی ہو جایا کرتا تھا۔ مگر میری دھشتیں، میری بے قراریاں، میری تلاشیں ہنوز بے نام تھیں۔ اور خود میرے ہی سامنے ان کی کوئی واضح تصویر نہیں تھی۔ اور اپنی اس بے بسی اور بے بضاعتی نے میرے دل کو مزید زخمی کر رکھا تھا۔ تاہم ان دنوں مجھے ایک تسکین ضرور حاصل تھی —— میری مرہٹن محبوبہ، ان یاس انگیز لمحات میں، ان اندھیروں میں، میرا ہاتھ پکڑ لیا کرتی، اور پھر میری روح کے لاتعداد آلام کو سمجھ کر، ایسی عارفانہ نگاہوں سے مجھے دیکھ لیا کرتی کہ میں زندگی سے متنفر ہو کر بھی اس بدبخت سے محبت کرنے لگ جایا کرتا تھا۔

لیکن وہ نگاہیں۔ وہ خلد آفریں نگاہیں——

وہ معنی خیز اور دل نشیں نگاہیں۔ اس دن 'پام گروو' میں چند ہی لمحوں کے لئے میرے سامنے رہیں۔ اور پھر میری زندگی میں ایک ہولناک خلا پیدا کر کے، ہمیشہ کے لئے، مجھ سے بچھڑ گئیں۔

بمبئی پہنچنے سے پہلے ہی میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ میں اپنی مرہٹن محبوبہ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ اور اس کو حرف بہ حرف ریاست میں پیش آنے والے تمام واقعات، پوری دیانتداری کے ساتھ بتا دوں گا۔ اور یہی ہوا۔ میں نے اس کو ایک ایک

> محنت کشوں کی
>
> غم انگیز داستانیں
>
> مجھے بے چین کر دیتی ہیں

بات بتا دی۔ فلوری سے مجھے کیونکر ہمدردی پیدا ہوئی۔ اور پھر وہ ہمدردی مجھے کیونکر اس کے قریب لے گئی۔ اور پھر اپنے دل کی غیر متوقع نئی کروٹ کا احساس مجھے کیسے ہونے لگا۔ اور بیک وقت اپنی روح میں مجھے، دو شمعیں جلتی کیسے نظر آئیں۔

وہ ہنستی رہی، اور معنی خیز نظروں کے ساتھ مجھے دیکھتی رہی۔ بات ختم ہوئی اور پھر کچھ دیر کے لئے ایک المناک قسم کی خاموشی طاری ہو گئی۔ اب میری نگاہیں اس کے لبوں پر مرکوز تھیں۔ مجھے شاید یہ محسوس ہو رہا تھا، کہ ابھی اس کے ہونٹ حرکت میں آئیں گے۔ اور ان سے تباہ کن زلزلے چھوٹ نکلیں گے۔ اور اس کے لبوں سے نکلے ہوتے نفرت کے الفاظ، میرے سر پہ یوں گرنے لگ جائیں گے، جیسے پہاڑوں پر سے لڑھکتے ہوتے دیو ہیکل، اور مرگ آفریں پتھر راہیروں کے اوپر گر گر، ان کے جسموں کو زمین کی طرح ہموار کر دیتے ہیں۔

میں ہنوز انہیں خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ وہ کھڑی ہو گئی۔ اور اس کی آنکھوں میں مجھے طوفان اٹھتے نظر آئے۔ اس نے انگریزی میں کہا۔

I want to cry, But not
in your Presence —
You Dont Deserve it.
Dont ever try to see
me again All is over.

یہ کہہ کر وہ تیزی کے ساتھ چلی گئی۔ باہر اس کی کار کھڑی تھی، اس میں بیٹھی اور تیزی سے اس کو چلاتی ہوئی، جوہو کی ریگ آلود سڑک کے آخری موڑ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گئی۔

پھر اس واقعہ کے چند ہی روز کے بعد، مجھے چھوٹے میاں کا ایک طویل خط ملا۔ جس میں انہوں نے بتایا کہ گوالیار کے راجہ صاحب، چھوٹے میاں کے ذوق فلمسازی کو ناپسند کرتے ہیں۔ اور وہ نہیں چاہتے کہ ان کی گدی کا روحانی رہبر۔ فلم سازی کے غیر روحانی اور گھٹیا کاروبار سے خود کو وابستہ کر دے۔

اس سرکاری فرمان کے پیش نظر، اپنے فلم کا سلسلہ قائم رکھنا چھوٹے میاں کے لئے غیر ممکن ہو گیا۔ اور دیکھتے

بمبئی کی تاریک
راہوں میں منزل کی تلاش؟

فرمان شاہی جاری ہوا
"فلم بندی بند کردو!"

یہاں اصول بکتے ہیں، دوستیاں بکتی ہیں

دیکھتے دیکھتے چند ہی روز میں میرے شکار کی فلم کا سلسلہ کٹ کے رہ گیا۔

عظیم صدموں کی یوں بھی زندگی میں خاصی فراوانی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ صدمات کو سہہ لینے کی عادت بھی ہو چکی تھی۔ اور باوجود یہ کہ بڑے بڑے مرحلوں سے، بڑی بڑی سنگلاخ اور حوصلہ شکن راہوں سے مسکرا کر گزر جانا بھی سیکھ رکھا تھا۔ مگر اس فلم کے دفعتاً بند ہو جانے کا صدمہ مجھ کو بہت ہی گہرے طور پر محسوس ہونے لگا۔ اور اس نے میرے دل و دماغ کو لاعلاج حد تک نچوڑ کے رکھ دیا۔ اس فلم کو میں نے بڑی چاہ سے بنانا شروع کیا تھا۔ اور اس کے ساتھ میرے بہت سے خواب وابستہ ہو چکے تھے جو تی اور مرئی دونوں لحاظ سے میں نے اس فلم میں، کچھ نئے تجربے کرنے کی بھی سوچ رکھی تھی۔ خاص طور پر، جنگل کی فلم بندی اور اس کے تمام مناظر میں مکالموں کو یکسر بے دخل کر کے میں نے ان کی جگہ، جنگل کے جاذب توجہ، کبھی اداس کر دینے والی اور کبھی خوفزدہ کر دینے والی، خاموشیوں کو کام میں لانے کی تجویزیں طے کر رکھی تھیں۔ اور اس وقت جتنے مناظر فلمبند کئے تھے، ان کی ڈگر بھی یہی تھی۔ خصوصاً شیر کے شکار کی تصویر کشی کے لئے میں نے تین کیمرے اور اسی لحاظ سے مختلف مقامات پر مچانوں کا بندوبست کر رکھا۔ فلم بندی کے پروگرام کے مطابق پہلے مجھ کو، ہانکنے والوں کی کارروائی با تفصیل فلم بند کرنا تھی۔

اور پھر اس کے بعد اپنے تمام کیمروں کے ساتھ اس گھاٹ پر آجانا تھا۔ جہاں پر بقول ریاست والوں کے شیر اکثر پانی پینے کے لئے پہنچا کرتا تھا اس سے پہلے [illegible] [illegible] پر میں نے چند تصویریں تو دیکھ ہی رکھی تھیں۔ لیکن خود کو اس مشغلے سے زیادہ باخبر کرنے کے لئے میں نے کچھ متعلقہ تحریروں سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش جاری رکھی تھی۔ میرا یہ شروع سے معمول رہا تھا، کہ جس موضوع پر فلم بناتا تھا، اس کے متعلقہ امور کو سمجھنے اور ذہن نشین کرنے کی حتی الوسع کوشش کرتا تھا۔

فلم کا فن میرے نزدیک ایک سنگین عملی اہمیت کا حامل ہونے لگا تھا۔ اور مجھ کو ان فلم سازوں پر اب بڑی حیرت ہونے لگتی تھی۔ جو اس فن کو بہت ہی سطحی توجہ کے ساتھ اکثر و بیشتر ٹال دینے والی بات کیا کرتے تھے۔ بہرحال یہ تو ایک ضمنی بات تھی، جو کہہ دی گئی۔ اس وقت جس صورت حال کا مجھے ذکر کرنا تھا، وہ تو یہ مسئلہ تھا کہ شکار کے فلم کے متعلق میں نے جتنے خواب دیکھے تھے، وہ سارے کے سارے اور اچانک رائیگاں ہو کے رہ گئے۔ اور میں اپنی مالی بے دست و پائی کی وجہ سے یہ بھی نہ کر سکا کہ اس کو اپنے ذمہ لے کر، پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتا۔ تاہم میں نے اس سلسلہ میں، چند سود خوار سیٹھوں اور فائنینشروں سے بات ضرور کی۔ اور ان کو اپنی فلم میں پیسہ لگانے اور اس کو مکمل کرنے کے لئے، بہت کچھ کہا سنا۔ مگر میری یہ تمام کوششیں بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ انہیں ایام میں اب مجھ پر یہ واضح ہونے لگا کہ سیٹھوں اور پیسہ لگانے والے برلاؤں

سیٹھوں سے

پیسہ نکلوانا

کوئی آسان کام نہیں

کی جیب سے پیسہ نکلوا لینے کا کام کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ اس کام کے لئے، جس چرب زبانی، دروغ گوئی اور پینترے بازی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مجھ میں نہیں تھی۔ میں تو ان زرگروں سے جب ملتا تھا وضع داری کے ساتھ ملتا تھا۔ اور کبھی گر کے

بات نہیں کرتا تھا۔ میں خود بین تو کبھی نہیں تھا۔ نہ اب ہوں۔ مگر خوددار ہمیشہ سے تھا۔ اور اپنی اس افتاد طبیعت کا سودا میں نے آج تک کسی سے نہیں کیا۔ اپنی عرق ریزی کو اپنے فن کو اور اپنے عزیز لمحات زندگی کو میں، ان بازاری سوداگروں ان ان داتاؤں کو فروخت ضرور کیا۔ مگر اپنے پندار فن کو۔ اپنے انسان کو ہمیشہ برقرار اور باعزت رکھ کے کیا۔ سر بازار لاکر میں نے اپنے فن کو نیلام کبھی نہیں کیا۔ مگر سنا ہے کہ یہ عزت نفس والی بات یہ ایک قابل قدر انسانی صفت، عام کاروباری اور مالی لین دین کی مرتبہ صرف نحو کے مطابق ہٹ دھرمی اور حماقت کے مترادف مانی جاتی ہے۔ اب جو تھا۔ میرے مزاج کی ساخت کچھ ایسی ڈھب کی تھی، اور میں نے سرے سے ہی اس کو بدلنے کی کبھی خواہش نہیں کی۔ اور نہ یہ خواہش کبھی مجھ میں پیدا ہو سکی۔ تو پھر نتیجتاً پیسے ٹکے کا مسئلہ اپنی زندگی میں ہمیشہ الجھی ہوئی صورت ہی میں رہا۔ اور آج تک اس کو سلجھنا نصیب نہیں ہوا۔ حالانکہ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ جن احباب اور متعلقین کے ساتھ میرا دن رات کا اٹھنا، بیٹھنا تھا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ ان میں اکثر و بیشتر، اپنی عظیم شخصیتوں، اپنی فنی عظمتوں اور دیگر برتری کے باوجود، پیسے کے معاملہ میں، گھٹیا سے گھٹیا اور بدترین سے بدترین بات تک کر بیٹھتے تھے۔ اخلاق کیا، مروت کیا، دوستی کیا، ہر رشتہ کو نظر انداز کر کے، بہمانہ حرص و ہوس کے ساتھ اپنی زرگرانہ اعتراض اور نفع کی گنجائشوں پر جھپٹ پڑتے تھے۔ اور ان میں میرے بڑے بڑے مشہور، متقی اور پرہیزگار دوست بھی تھے۔ میں نے ان کے حرص و ہوس، اور ان کی سوہری شخصیتوں کے یہ ناٹک ایک بار نہیں ہزار بار دیکھے، اور یہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہزار ہزار بار زخمی بھی ہوا۔ مگر یہ سب تب سوچنا ہی بے سود تھا۔ اس لئے کہ کیش کی دکان دنیائے فلم میں بھی جگہ جگہ پر قائم تھی۔ جہاں پر فن ہی نہیں، انسان اور اس کی اخلاقی اقدار بھی بک جاتی تھیں۔ ہمالائی خودداریاں بک جاتی تھیں۔ جہاں ہر مرد و زن بک جاتے تھے۔ اصول بک جاتے تھے، دوستیاں بک جاتی تھیں۔ غرض یہ کہ میں نے یہاں بہت کچھ بکتے دیکھا ہے۔

اس کی مزید وضاحت اگر لازم ہوئی تو اپنی یادداشتوں کی آئندہ قسطوں میں اسے ضرور پیش کر دوں گا۔ مگر سر دست مجھے جو بیان کرنی ہے، وہ میری ان پریشانیوں اور دل دردیگیوں کی داستان ہے۔ جو شکار کا فلم بند ہو جانے کے بعد بڑی شدت کے ساتھ شروع ہو گئی۔ اب لے دے کے میری زندگی میں ایک ہی قطرۂ شبنم رہ گیا تھا جو میرے دل کی، آگوی کے لامتناہی سلسلوں میں میری روح کو قدرے آسودگی پہنچا سکتا تھا،

وہ قطرۂ شبنم ظاہر ہے فلوری تھی ـــــ اسے بھی فلم کے بند ہو جانے کا بہت صدمہ تھا ـــــ اور ایک بار تو وہ رو بھی پڑی تھی۔ اور اس کا یہ زخم بھی پوری طرح نمایاں ہو کر اس کی آنکھوں میں آ گیا تھا۔ اس کے، زخم کی وہ سرخیاں اس کی معصوم آنکھوں سے جھلکتی ہوئی اب بھی مجھ کو کسی کسی وقت محسوس ہو جاتی ہیں۔ تاہم کر ہی کیا سکتے تھے۔ اس زخم کو بھی سہنا تھا، سہہ گئے۔ یہ زہر بھی پینا تھا، پی گئے ـــــ پھر اس کے بعد، چند روز تک میرا اس کا یہ باہمی غم خواریوں اور ہمدردیوں کا سلسلہ جاری رہا۔

لیکن اسی زمانہ میں مجھ پر ایک اپنا نیا راز افشا ہوا۔ فلوری اور میں شام کی تنہائیوں میں ایک جگہ محوِ گفتگو تھے اور حسبِ معمول وہ مجھ سے ہمدردی کا اظہار کر رہی تھی۔ کہ مجھے اس کے الفاظ اپنے ذہن پر پتھروں کی طرح برستے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس سے پیشتر اگرچہ ایسی باتیں اکثر ہوا ہی کرتی تھیں۔ مگر جانے وہ شام کیسی تھی۔ اس کا رجحان کیا تھا، اس کا مزاج کیا تھا، کہ وہی لفظ آج مجھ کو میرے ذہن کو روند گئے۔ میرے تمام روح و بدن کو لہولہان کر گئے ـــــ اور میں نے ایک غایت درجہ وحشیانہ انداز میں فلوری کو ٹوک کر کہہ دیا۔ کہ وہ آئندہ مجھے ہمدردی جتانے کی کوشش کبھی نہ کرے۔ مجھے ہمدردیاں اپنی توہین کے برابر معلوم ہوتی ہیں۔ ہمدردی کے الفاظ مجھے زہر کے گھونٹ کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ اور میں یہ سن کر اپنی نظروں میں حقیر ہونے لگتا ہوں۔ اور میں وقت سے پہلے مرنے لگتا ہوں۔ اور میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اور زندہ رہ کر ہر محاذ پر حالات سے لڑنا چاہتا ہوں۔

فلوری نے شاید چند لمحوں کے لئے مجھے دیوانہ گردان لیا ہو، اس کے ناپختہ اور معصوم ذہن سے جانے کیسے کیسے شبہات اور خیالات گزر گئے ہونگے۔ مگر تاہم اس نے ایسی کوئی بات تو ظاہر نہیں ہونے دی۔ "اقرار" کی ایم سادگی کہہ کے خاموش ہو گئی۔

فلوری ان دنوں اگرچہ میرے درد اور غموں کے رشتوں میں پوری طرح منسلک ہو چکی تھی، اس کا جسم اس کی روح اور اس کے تمام حسن، اور اس کی تمام سحر آفرینیاں مطلقاً میری تھیں۔ میرے قبضے میں تھیں۔ مگر با ایں ہمہ۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوتا رہتا تھا کہ وہ فقط عورت۔ اور اسکا دل گداز حسن ہی تو نہیں۔ جس کی فراہمی میرے دل کے تمام تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے۔ آشفتہ اور سیماب صفت زندگی کی مانگ تو کچھ اور بھی ہے۔

بمبئی کے گلی کوچوں میں، لاتعداد زندگیوں کے کراہتے ہوئے وہ دل خراش مناظر ـــــ قدم قدم پر وہ سر پر منڈلاتے ہوئے افلاس کے سائے ـــ وہ آنکھوں میں بے اختیار گھسی ہوئی، بدحال مجبوری کی شکار صورتیں یہ سب بھی تو میرے دل سے آشنائی چاہتی ہیں۔ یہ سب بھی تو مجھے اپنے پاس بلا رہی ہیں ـــــ ان کو دیکھ دیکھ کر میرا دل پھٹنے کیوں لگ جاتا ہے۔ اور یہ مجھے کس جہت پر" کس سمت چلنے کی دعوت دے رہی ہیں۔ ان اندھیروں میں مجھے کس منزل کی تلاش لاحق ہوتی رہتی ہے۔ اب میں بیکار اور بے روزگار بھی تھا۔

چنانچہ میں یہ مجبوری اپنی ہمشیرہ کے بنگلہ پر، رہنے کے لئے مجبور ہو گیا۔ اپنے رہن سہن کے اخراجات برداشت کر لے کی سکت اب مجھ میں نہیں تھی۔

ہمشیرہ کے گھر منتقل ہوتے ہی، میں نے ایک کمرہ میں اپنے آپ کو قید کر دیا۔ اور جو طوفان دل میں اٹھ رہے تھے۔ ان کو ایک ڈرامے کی شکل میں قلم بند کرنا شروع کر دیا۔ اور مجھ کو اپنا ذہن ایک نئی کروٹ لیتے ہوتے محسوس ہوا۔



بقیہ

ننگے جسموں کی نمائش

تمام خون تم نے نچوڑ لیا ہے ـــــ ظالم ایک قطرہ خون کا دے دو تاکہ میں اپنے بچے پر چھائی ہوئی موت کو بھینٹ دوں۔ دے دو ا خون کا قطرہ ـــــ اس نے التجا کی ـــــ! میں نے کہا کون سا خون ..... میں نے کبھی تمہارا خون نہیں لیا۔ کتنی عجیب بات ہے ...... وہ چلا اٹھی! فریبی ـــــ دغاباز اپنے جسم کی طرف دیکھوں ـــــ ابھی تک ہمارا خون تمہارے جسم پر چمک رہا ہے۔ اپنے چہرے پر بکھری طمانیت سے پوچھو وہ تمہیں ہمارے پسینے کی چمک بن کر دکھائی دے گی۔ اور وہاں دور شہر میں اس پرانی بستی سے پرے سونے کی ایک عمارت میں ہمارا خون پسینہ ہر صبح سورج کی اولین کرنوں سے جگمگا اٹھتا ہے ـــــ کیا ہم اتنے اندھے ہیں کہ اپنا خون نہیں پہچان سکتے! پھر وہ عورت تیزی سے میری جانب بڑھتی ہے اور میں تیزی سے پیچھے کی جانب بھاگتا ہوں ـــــ میں بھاگتا جاتا ہوں ـــــ اور ننگے جسم پھر سایوں میں تبدیل ہو کر میرے تعاقب میں چل پڑتے ہیں ـــــ اور کہتے ہیں ـــــ ہمارا صدیوں پرانا خون ہمیں واپس کر دو ـــــ صدیوں پرانا پسینہ ہمیں واپس کر دو ـــــ واپس کر دو ـــــ لوٹا دو ـــ اور پھر میں بھاگ کر اس سونے چاندی سے بنی ہوئی عمارت میں پناہ لیتا ہوں ـــــ میں سب سے اونچی منزل پر کھڑے ہو کر دیکھتا ہوں۔ وہ عورت ـــــ بیدم ہو کر گر پڑتی ہے ـــــ اور اس کا سایہ تپتی زمین سے لپٹ کر ماتم کرنے لگتا ہے۔ اور پھر ایک ننگا جسم اس کے بچے کی اکڑی ہوئی لاش اس کی گود میں اچھال دیتا ہے ـــــ مگر عورت بے حس و حرکت پڑی رہتی ہے ـــــ پھر میں دیکھتا ہوں کہ ننگے جسم ان کی لاشیں اٹھا کر اس سمت چل پڑتے ہیں جہاں دور بڑی بڑی چمنیوں سے سیاہ گاڑھا دھواں نکل رہا ہوتا ہے ـــــ اور صرف ایک بازگشت دھیرے دھیرے گونجتی ہے ـــــ ہمارا صدیوں پرانا خون ـــــ مگر میں زور سے سر کو جھٹک دیتا ہوں ـــــ اور چمنیوں کا سیاہ گاڑھا دھواں آسمان کی انتہائی بلندیوں کی جانب بڑھتا ہی جاتا ہے ـــــ

"عقاب چاہے کتنی ہی نیچی پرواز کیوں نہ کرے، پھر بھی وہ مرغی کے مقابلے میں بلند رہتا ہے!"



"ہمارا ہر عمل سامراج کے خلاف نعرۂ جنگ ہے"

وہاب صدیقی

۹ر اکتوبر آیا اور خاموشی سے گزر گیا۔ کوئی جلسہ ہوا نہ تقریب کسی کو خیال تک نہ آیا کہ ۹ر اکتوبر کو ایک عظیم انقلابی کی برسی ہے اور انقلابی بھی ایسا کہ جو پوری زندگی سامراج کے خلاف سینہ سپر رہا۔ کسی بھی مرحلہ پر مصالحت قبول نہ کی۔ جس کا کہنا تھا کہ "اگر کوئی چیز اہم ہے تو وہ انقلاب، اس کے مقابلے میں ہماری ذات، ہمارا وجود کوئی اہمیت نہیں رکھتا،" جس کا نعرہ انقلاب لاطینی امریکہ سے نکل کر امریکہ اور یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ اس عظیم انقلابی کا نام چی گویرا ہے۔

گذشتہ دنوں کراچی میں چی گویرا کا چرچا تھا۔ اس کی وجہ ایک مقامی سینما میں "چی" فلم کی نمائش تھی۔ ہم نے جب اس فلم کا اشتہار اخبار میں دیکھا تو یقین نہ آیا کہ جو وزارت اطلاعات و نشریات طبقاتی جد و جہد پر مبنی پروگرام ٹیلی ورژن پر بند کر دیتی ہو، ریڈیو پر مزدوروں کے پروگرام میں فلمی گیت نشر کرواتی ہو اور جس کا سنسر بورڈ ریاض شاہد کی فلم "یہ امن" سے گوریلا جنگ کے تمام مناظر کاٹ دیتا ہو، اس نے "چی" فلم کو کیسے پاس کر دیا۔ بہر حال یہ فلم دیکھی، فلم کیا تھی، حقائق سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ خالص امریکی پروپیگنڈہ تھا۔ چی گویرا کے کردار کو بالکل مسخ کر کے پیش کیا گیا تھا۔ چی کو ظالم اور لٹیرا بتایا گیا تھا۔ کسانوں کی مرغیاں اور جانور لوٹتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ فیڈل کاسترو کو کند ذہن، اکھڑ اور چی کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی دکھایا گیا تھا۔ آج تک پاکستان میں ایسی کوئی فلم ریلیز نہیں ہوئی، جس میں کسی سربراہ مملکت کی توہین دکھائی گئی ہو۔ یہ موجودہ وزارت اطلاعات و نشریات اور اس کے سنسر بورڈ کا ہی کارنامہ ہے کہ اس نے پاکستان کے دوست ملک۔ کیوبا کے سربراہ کی توہین پر مشتمل فلم کی نمائش کرنے کی اجازت دیدی۔ پس پردہ یہ جذبہ کارفرما تھا کہ انقلابیوں کو ظالم، لٹیرا دکھا کر وطن عزیز کی انقلابی تحریک کی راہ میں دیوار حائل کی جائے۔ عوام کو انقلابیوں سے نفرت دلائی جائے اور پاکستان پر سامراج کی گرفت کو مضبوط سے مضبوط تر کیا جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ چی گویرا کے افکار میں خامیاں تھیں۔ چی گویرا پارٹی ڈسپلن پر زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ اسی وجہ سے اُسے کیوبا کی کمیونسٹ پارٹی میں کوئی کلیدی عہدہ نہیں دیا گیا۔ حالانکہ انقلاب کیوبا میں چی کی ناقابل فراموش خدمات ہیں۔ کیوبا کی انقلابی تاریخ اس کے ذکر کے بغیر نامکمل رہتی ہے۔ مارکسزم، لینن ازم اور افکار ماؤزے تنگ کے مطابق سیاسی افکار اور پارٹی بندوق کو کنٹرول کرتی ہے۔ مگر چی گویرا بندوق کو سیاسی کنٹرول سے بالاتر سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بولیویا میں اس نے کسانوں میں سیاسی کام کرنے کی بجائے بندوق پر زیادہ زور دیا۔ اس کی توجہ کی مرکز بندوق بنی رہی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسے کسانوں کی حمایت حاصل نہیں ہو سکی۔ چی گویرا نے اپنی ڈائری میں جگہ جگہ اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ان تمام خامیوں کے باوجود "چی" عظیم تھا۔ سامراج اور اس کے گماشتوں کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ چی پر نکتہ چینی کریں۔ لینن نے کہا ہے:۔

"عقاب چاہے کتنی ہی نیچی پرواز کیوں نہ کرے پھر بھی وہ مرغی کے مقابلے میں بلند رہتا ہے!"

چی گویرا گوریلا جنگ کا ماہر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عوامی جنگ میں طویل حکمت عملی اپنائی جاتی ہے۔ ایک دو لڑائیوں میں فیصلہ نہیں ہوتا۔ عوامی جنگ مسلسل مسلح جد و جہد کا نام ہے جو برسوں پر محیط ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتا ہے —!

انقلابی جنگیں — بازاروں میں آنسو گیس کے مقابلے میں سنگریزوں کے پتھراؤ سے نہیں لڑی جائیں گی، نہ پرامن ہڑتالوں سے نہ وہ بپھرے انسانوں کے جذبات کے لاوے کا ابال ہو گا۔ جس میں دو تین روز میں آمریت کے ظلم کی عمارت ڈھا دی جائے گی۔

چی کے خلاف وزارتِ اطلاعات و نشریات اور سنسر بورڈ کی سازش

جنگ طویل اور ہولناک ہوگی
میدانِ جنگ گوریلوں کی قلعہ بندیاں
ہوں گی۔
شہر ہوں گے نبرد آزماؤں کے گھر
ہوں گے جہاں ظالموں کے ہاتھ مجاہدوں
کے خاندانوں کو آسان شکارگاہ سمجھ کر دراز
ہوں گے۔
دیہی آبادی میں مقتولوں کی کٹیا
میدانِ جنگ بنے گی۔
دشمن کی بمباری سے تباہ شدہ شہر
اور دیہات میدانِ جنگ ہوں گے۔
اور پھر فتح ——— آخری فتح !"

سوال پیدا ہوتا ہے کہ گوریلا جنگ کے ماہر ہونے کے باوجود وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بولیویا کیوں چلا گیا؟ کیا وہ سمجھتا تھا کہ چند افراد کی مدد سے بولیویا میں انقلاب لایا جاسکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ چی نے بولیویا جانے سے پہلے بولیویا کے انقلابیوں سے تعلقات استوار کیے تھے، بولیوین کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری جنرل ماریو مونجے نے اپنی حمایت کا یقین دلایا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کے ایک اہم عہدیدار آسکر زامور نے گوریلا جنگ میں تعاون کی پیش کش کی تھی۔ بولیویا کے کان کن مزدوروں کے رہنما موسا گویرا نے بھی تعاون کا یقین دلایا تھا۔ جب بولیویا کے تمام انقلابی گروہوں نے چی کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تو چی بولیویا چلا گیا۔ لیکن مونجے، آسکر زامور گروہ نے چی گویرا سے تعاون نہیں کیا۔ البتہ موسا گویرا کا قدم نہیں ڈگمگایا۔ وہ اپنے وعدے پر قائم رہا اور اس نے انقلاب کی راہ میں مردانہ وار جان دے دی۔

مونجے گروہ کے بعض گوریلوں نے انٹی اور کوکو پریڈو کی قیادت میں چی کا آخری دم تک ساتھ دیا اور انقلابی تاریخ میں اپنے خون سے ایک نیا باب لکھا۔ دوسری جانب مونجے اور آسکر زامور، چی کی مخالفت کرتے رہے۔ انہوں نے لاپاز میں ان تجربہ کار گوریلوں کو روک لیا جو چی کے گوریلا دستوں میں شامل ہونے جا رہے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بولیویا میں انقلابی جنگ میں حصہ لینے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن ان کی نشوونما اور صلاحیتوں کو بولیویا کے نام نہاد اشتراکی لیڈروں نے برباد کر دیا۔

درحقیقت مونجے جعلی انقلابی موقع پرست اور نام نہاد اشتراکی تھا۔ اس بہروپیے انقلابی کو انقلاب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ انقلاب کے نام پر اپنی لیڈری کو چمکانا چاہتا تھا۔ مونجے اور چی کے درمیان اختلاف کی وجہ قیادت کا مسئلہ تھا۔ مونجے پوری تحریک کی قیادت اپنے ہاتھ میں



"سامراج کے مقابلے میں
جنگ طویل
اور ہولناک ہوتی ہے۔"

رکھنا چاہتا تھا اور اس نے اس خواہش کا برملا اظہار بھی کیا۔ چی گویرا اپنی ڈائری میں لکھتا ہے:

"مونجے سے گفتگو شروع میں عمومی اور فروعی رہی لیکن اس نے جلد ہی بنیادی سوال اٹھائے جن کا خلاصہ یہ تین شرائط تھیں:

ا: "وہ پارٹی کی قیادت سے مستعفی ہو جائے گا —!

ب: جب تک انقلاب کا مقصد بولیویا کی آزادی ہے اس کا فوجی اور سیاسی لیڈر وہ ہوگا!

ج: جنوبی امریکہ کی دوسری ریاستوں سے تعلقات کا ذمہ دار وہ ہوگا۔"

چی گویرا آگے چل کر لکھتا ہے:

"جہاں تک دوسری بات کا معاملہ ہے میں اسے کسی صورت میں قبول نہیں کر سکتا۔ فوجی قائد میں ہوں گا اور اس کے بارے میں کسی قسم کے ابہام کی گنجائش ہی نہیں۔"

چی فوجی قائد بننے کے لیے اس لیے اصرار کر رہا تھا کہ مونجے کو گوریلا جنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اسی اختلاف کی وجہ سے مونجے اور اس کے یارِ غار آسکر زامور نے چی کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ یہی اختلاف چی کی ناکامی کا سبب بن گیا۔

مونجے گروہ کی انقلاب دشمنی اور موقع پرستی نے چی کے لیے مشکلات پیدا کر دیں۔ مونجے نے چی کے خلاف پراپیگنڈہ کیا۔ اسے طالع آزما اور تصوراتی اشتراکی قرار دیا۔ اس لیے مقامی آبادی چی سے تعاون کرنے میں گریز سے کام لیتی رہی۔ چی اپنے گوریلوں میں اضافہ نہ کر سکا۔ اس کے پاس ایک سو گوریلے بھی نہیں تھے۔ اپنی ڈائری میں وہ ایک جگہ لکھتا ہے:

"حکومت کا ڈھانچہ تیزی سے بکھر رہا ہے
کاش ہمارے ساتھ اس وقت صرف سو
آدمی اور ہوتے !"

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کسانوں نے چی کا ساتھ کیوں نہیں دیا؟ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ چی بولیویا کے کسانوں کے لیے اجنبی تھا۔ اس نے کسانوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے اور ان سے گھل مل جانے کی بجائے اپنا زیادہ وقت جنگی محاذ پر صرف کیا۔ دوسری جانب بولیویا کی رجعت پسند حکومت، اخبارات اور موقع پرست انقلابی چی کے خلاف پراپیگنڈہ کرتے رہے۔ چی کے وسائل اتنے نہیں تھے کہ وہ اس پراپیگنڈے کا جواب دیتا۔ سرکاری پراپیگنڈہ مشینری نے چی کو ڈاکو، لٹیرا اور دہشت پسند کی حیثیت سے عوام کے سامنے پیش کیا۔ اور جھوٹ بولنے میں آل انڈیا ریڈیو کا بھی ریکارڈ توڑ دیا۔ ۱۲ جون کو ریڈیو نے روزنامہ "پریزینشا" کے حوالے سے یہ خبر نشر کی کہ:

"ہفتے کے روز جھڑپ میں چی ہلاک ہو گیا ہے!"

یہ جھوٹ کی انتہا تھی۔ ۱۱ ستمبر کو ریڈیو نے پھر اعلان کیا کہ

"چی کو ہلاک ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے اور اس کے متعلق ساری خبریں پراپیگنڈہ ہیں ؛"۔ لیکن ۱۱ستمبر کی ہی رات کو ریڈیو نے ایک ایسا اعلان نشر کیا جس سے چی کی ہلاکت کی خبر کی تردید خود بخود ہو گئی ۔ نشریہ میں کہا گیا —— "جو شخص ایسی اطلاع دے گا جو چی کو زندہ یا مردہ پکڑنے میں معاون ثابت ہو گی، اسے پچاس ہزار ڈالر (۴۲ سو امریکی ڈالر) انعام دیا جائے گا۔"

ایسے گمراہ کن پراپیگنڈہ کی وجہ سے چی کا امیج عوام میں خراب ہو گیا ۔ حالانکہ چی اور اس کے ساتھی کسی گھر یا فارم میں قیام کرتے تھے، تو تمام اخراجات خود برداشت کرتے تھے اور ملازمین کو خدمت کا معاوضہ بھی دیا کرتے

سامراجی مشینری نے
چی گویرا
کو دہشت پسند اور
لیٹر ابنا دیا۔

تھے ۔ایک جگہ چی لکھتا ہے :۔

"فارم کے ملازمین اور ملازمہ کو فی کس دس ڈالر حق المحنت کے طور پر ادا کیے گئے ..... !"

چی گویرا کٹر سامراج دشمن اور عظیم انقلابی تھا ۔ اس کے افکار اور عمل میں کوئی تضاد نہیں تھا ۔ قول اور فعل میں مطابقت تھی، خلوص اور سچائی تھی ۔ اس نے سہ براعظمی کانفرنس کے لیے اپنے پیغام میں کہا تھا :۔

"ہمارا ہر عمل سامراجیت کے خلاف نعرۂ جنگ ہے ، موت جہاں بھی ہمیں آئے ہم مسکرا کر اس کا استقبال کریں گے بشرطیکہ ہمارا نعرۂ جنگ کسی دل میں اتر چکا ہو دوسرے ہاتھ ہمارے ہتھیار اٹھانے کے لیے مشتاقانہ آگے بڑھیں ، ماتمی ترانوں کی بجائے توپوں کی گھن گرج میں ہمارا جنازہ اٹھے ، جنگ اور جیت کی نئی رجز سے فضاؤں کے دل دہلیں ۔"

...... اور ۹ر اکتوبر کو اس نے اپنے لہو کی سرخی سے ان الفاظ کی لاج رکھ لی !!!

ریاض ساغر

غزل

لٹنے نہ پائے اپنا چمن زار دیکھنا
"اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا"

اے اہلِ نطق آج سرِ مقتلِ جنوں
اک بے زباں کی جرأتِ اظہار دیکھنا

کچھ سر بریدہ جسم ہیں کچھ پا شکستہ لوگ
شاید یہی ہے کوچۂ دلدار دیکھنا

اپنی ہتھیلیوں پہ پھولے چلے تو ہو!
اونچی مگر ہے حسن کی سرکار دیکھنا

وہ جس کی فردِ جرم میں لاکھوں کے قتل ہیں
بیٹھا نہ ہو چھپ کے پسِ دیوار دیکھنا

تھم سی گئی ہیں رات کی بے نور گردشیں
پھیلے ہوئے ہیں صبح کے آثار دیکھنا

ساغر ہجومِ زہرہ جبیناں کے درمیاں
اک بوالہوس کی گرمیٔ گفتار دیکھنا

شیر باز خان مزاری نے گورنر بلوچستان کو دعوت کیوں دی؟

فیاض احمد

گذشتہ دنوں ضلع ڈیرہ غازی خان سے قومی اسمبلی کے رکن سردار شیر باز خان مزاری نے صوبہ بلوچستان کے گورنر میر غوث بخش بزنجو کے اعزاز میں اپنی رہائش گاہ واقع ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی پر دعوت طعام دی جس کی رپورٹ اخبارات میں مع تصاویر شائع ہوئی ہے۔ میں اس دعوتِ طعام کے پس منظر میں ان باتوں کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ جنہیں آئندہ چل کر ضلع ڈیرہ غازیخان کی سیاسی صورتحال پر اثر انداز ہونا ہے۔

یہ بدقسمت ضلع صوبہ پنجاب کا پس ماندہ ترین ضلع ہے جہاں جہالت، غربت، افلاس، ناداری، مایوسی اور بے روزگاری کا مکمل راج ہے۔ یہاں نہ کوئی مل ہے اور نہ کوئی انڈسٹری اور کارخانہ۔ پنجاب کا یہ واحد ضلع ہے۔ جسے پاکستان بننے سے پہلے یا بعد میں کسی وزارت، سفارت یا نظامت میں کوئی نمائندگی نہیں ملی۔ صوبہ پنجاب ایسے ترقی یافتہ اور متمدن صوبے کے ساتھ رہتے ہوئے اس کی قدیم پسماندگی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ جو تھوڑا بہت شعور عوام میں پیدا ہوا ہے یا بیداری آئی ہے وہ محض تاریخی عمل کا نتیجہ ہے۔ اس کی پس ماندگی کی تمام تر ذمہ داری ان حکومتوں پر عائد ہوتی ہے جو وقتاً فوقتاً برسر اقتدار آتی رہیں۔ یا پھر ان پیروں اور میروں پر عائد ہوتی ہے۔ جن کا یہاں سکہ چلتا ہے۔ یہ لوگ فصلی بٹیرے ہیں جو صرف انتخابات کے موسم میں نمودار ہوتے ہیں۔ اور انتخابات ختم ہونے کے ساتھ ضلع سے ایسے غائب ہوتے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ کوئی لاہور چلا جاتا ہے اور کوئی کراچی میں ڈیرہ جما لیتا ہے اور کچھ تبدیلی آب و ہوا کے لئے بیرون ملک چلے جاتے ہیں۔ اور پھر انتخابات کے موسم کے ساتھ لوٹ آتے ہیں۔ جب آتے ہیں تو خدمتِ عوام کے جذبہ سے پوری طرح سرشار ہو کر آتے ہیں۔ لنگر کھولتے ہیں، بلا ٹکٹ مسافروں کی سہولت کے لئے بسوں کا انتظام کرتے ہیں۔ قلندر بنتے ہیں بھبھوت ملتے ہیں۔ در در جا کر ووٹ کی بھیک مانگتے ہیں۔ سادہ لوح عوام ووٹوں سے ان کی جھولیاں بھر دیتے ہیں۔ ان کو کبھی مایوس نہیں لوٹاتے۔ سال ہا سال سے یہ تماشہ جاری ہے نہیں معلوم یہ کھیل اور کب تک جاری رہے گا؟

وقتاً فوقتاً برسرِ اقتدار آنے والی حکومتوں نے اس ضلع کی حالت کو سدھارنے کی حتی الامکان کوئی کوشش نہیں کی۔ پیروں، میروں اور سرداروں نے عملاً اس طرف توجہ نہیں دی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج یہاں کے لوگ مایوسی کا شکار ہیں۔ مطلب پرست سردار اس مایوسی سے فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ مایوسی کے یہ سائے اور گہرے ہو جائیں تاکہ وہ اس مایوسی اور پسماندگی کا الزام صوبہ پنجاب کی حکومت کے سر تھوپ کر ضلع ہذا کے عوام کو باور کرا سکیں کہ ان کی پسماندگی کی وجہ یہی ہے کہ صوبہ پنجاب کے ترقی یافتہ اضلاع کے لوگ ان کا استحصال کرتے رہتے ہیں، اور ان کو ترقی نہیں کرنے دیتے۔ چنانچہ درپردہ ایسی کوششیں ہو رہی ہیں کہ ضلع ڈیرہ غازی خان کو صوبہ بلوچستان میں شامل کر لیا جائے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ پسماندہ ضلع پس ماندہ صوبہ میں شامل ہو جائے گا اور وہ شعور اور بیداری جو تاریخی عمل نے اس ضلع کے عوام میں پیدا کی ہے، مزید بڑھنے سے رک جائے گی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ سرداری اور جاگیرداری سسٹم کو اور زیادہ مستحکم کیا جا سکے گا تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ بلوچی ثقافت کو برتری حاصل رہے گی۔

صوبہ بلوچستان کی موجودہ حکومت انہی اصولوں پر کام کر رہی ہے۔ وہ ایک طرف تو جاگیرداری نظام کو مستحکم کرنا چاہتی ہے۔ دوسری بلوچی نسل و ثقافت کی برتری کے احیاء میں لگی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوبہ بلوچستان سے تمام پنجابی و غیر پنجابی مگر غیر مقامی ملازمین کو ان کے متعلقہ صوبوں میں واپس بھیجا جا رہا ہے۔ غیر مقامی ملازمین کو بلوچستان سے نکال دینے کا اصل سبب یہی ہے کہ موجودہ صوبائی حکومت خالص بلوچی صوبہ کے قیام کے منصوبے پر عمل کر رہی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ کوئی غیر باشندہ اس کے صوبے میں رہے۔ کیوں کہ جتنے غیر مقامی وہاں آباد ہیں اور ملازمت میں ہیں جب تک وہاں رہیں گے حکومت عظیم تر بلوچستان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر نہیں کر سکے گی۔

مزے کی بات یہ ہے کہ بلوچستان کی حکومت کے اس فیصلے سے (غیر مقامی ملازمین کو بلوچستان سے نکالنے کے فیصلے سے) سب سے زیادہ متاثر ہونے والا ضلع پنجاب کا ضلع ڈیرہ غازی خان ہے۔ بلوچستان میں غیر مقامی ملازمین بالخصوص اسکولوں کے مدرسین اور محکمہ مال کے پٹواریوں وغیرہ میں کثیر تعداد ضلع ڈیرہ غازیخان کے باشندوں کی ہے۔ ضلع ڈیرہ غازی خان میں پہلے سے بے روزگاری عام ہے جب یہ ملازمین واپس اپنے ضلع میں جائیں گے تو اس وقت جو صورتِ حال پیدا ہوگی اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل بات نہیں۔ اس سے پہلے سے پیدا ہوئی مایوسی میں اضافہ ہوگا۔ اور وہ لوگ جو ضلع میں بڑھی ہوئی مایوسی کو اپنے مفاد میں استعمال کرنے پر کمر باندھے بیٹھے ہیں اپنی سرگرمیاں اور تیز کر دیں گے۔

جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ ضلع ڈیرہ غازیخان میں بے روزگاری غربت اور ناداری کا راج ہے۔ اور پسماندگی اور احساس کمتری کی فراوانی ہے۔ چالاک جاگیردار اور ان کے ایجنٹ اس کی ذمہ داری اپنے سر لینے کے بجائے پنجاب کے عوام کے سر تھوپنے کے درپے ہیں۔ وہ اس قسم کا پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں اور آئندہ کرانے والے ہیں کہ پنجاب کے لوگ اس ضلع کے لوگوں کو لوٹ رہے ہیں۔ نہ ملازمتوں میں ان کو جائز حق ملتا ہے اور نہ ہی دیگر وسائل میں اس ضلع کو مساوی درجہ دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ضلع تو پس ماندہ رہ گیا ہے جبکہ دوسرے اضلاع بشمول مظفر گڑھ ترقی کرتے جا رہے ہیں۔ لہٰذا اس کا حل یہ ہے کہ یہ ضلع صوبہ بلوچستان میں شامل کر دیا جائے۔ بظاہر یہ باتیں صحیح معلوم ہوتی ہیں کیونکہ ضلع ہذا واقعی پسماندہ ہے۔ یہاں کے تعلیم یافتہ نوجوان نوکری کے لئے مارے مارے پھر رہے ہیں۔ جبکہ اندرون پنجاب کے اضلاع کے تعلیم یافتہ نوجوان اس ضلع میں اچھی اچھی ملازمتوں پر فائز ہیں۔ اسی طرح ترقی کے دوسرے وسائل ہیں۔ اس ضلع کو کبھی اس کا جائز حق نہیں ملا۔ مگر ضلع ہذا کو بلوچستان میں شامل کرانے کے لئے درپردہ کوشش کرنے والوں کا اصل مقصد یہ ہرگز نہیں کہ اس ضلع کے عوام کی خوشحالی کے لئے یہ کام کیا جائے۔ بلکہ اصل مقصد جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کو استحکام بخشنا ہے جو بصورتِ موجودہ صوبہ پنجاب میں رہتے ہوئے ان لوگوں کے لئے بہت مشکل ہے۔ یہ لوگ اگر ترقی چاہتے تو صوبہ پنجاب کے اندر

رہتے ہوئے بھی عوام کو دلا سکتے تھے۔ ان کی ملازمتوں کا تحفظ کر سکتے تھے، ان کو روزگار دلا سکتے تھے، تعلیم عام کرا سکتے تھے۔ غرض ہر کام جو مفید ہوتا کرا سکتے ہیں اور کرا سکتے تھے۔ مگر ان کو اس سے کوئی غرض نہیں وہ صرف بلوچی نسل و ثقافت کی برتری کے احیاء اور جاگیرداری کے استحکام کے لئے کام کرنا چاہتے ہیں۔

صوبہ پنجاب نے بلاشبہ ضلع ڈیرہ غازی خان کو پسماندہ رکھا ہے مگر یہ پسماندگی ہزار درجے بہتر ہے اس سے کہ ضلع کو جاگیرداروں کا غلام بنایا جائے۔ بلوچستان میں شمولیت کے ساتھ جاگیرداروں و سرمایہ داروں کی غلامی لازم و ملزوم بات ہے۔ بلوچستان کے مقامی باشندوں میں ابھی اس شعور کی شاید بہت کمی ہے، جو جاگیرداری نظام کی خوبیوں اور خامیوں میں امتیاز کر سکے۔ اگر یہ چیز نہ ہوتی تو وہ اپنے ان غیر مقامی ملازم بھائیوں کو بلوچستان سے ہرگز نہ جانے دیتے جن کے قدم سے بلوچستان کی سرزمین پر ہر علم کی کرنیں پھوٹیں وہ اپنے ان محسنوں کو بلوچستان نہ چھوڑنے دیتے جو ان کے دفاتر اور ادارے چلاتے رہے ہیں۔

ضلع ڈیرہ غازی خان کو بلوچستان میں شامل کرانے کے خواہاں سرداروں نے درپردہ کوششیں شروع کی ہوئی ہیں۔ اس سے قبل سنا گیا تھا کہ سردار محمد اکبر خاں بگٹی جو کہ سردار شیر باز خان مزاری کے قریبی رشتہ دار ہیں اس تجویز پر غور کر رہے ہیں۔ ایک دفعہ ڈیرہ غازی خان میں اس کا بڑا چرچا ہوا تھا۔ ایک جلوس بھی نکلا تھا مگر معاملہ پھر دب گیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ ضلع ڈیرہ غازی خان کو صوبہ بلوچستان میں شامل کیا جائے۔ ڈیرہ غازیخان صوبہ بلوچستان کا سرمائی صدر مقام ہوگا۔ چونکہ بلوچستان پسماندہ صوبہ ہے۔ خواندگی کا تناسب بھی کم ہے اور آبادی بھی کم ہے اس طرح ضلع ہذا صوبہ کا نہ صرف تعلیم یافتہ ضلع ہوگا، بلکہ آبادی کے لحاظ سے کوئٹہ کے بعد دوسرے نمبر پر بڑا شہر ہوگا۔ اس طرح یہاں کے عوام کو بلوچستان میں روزگار کے مواقع بھی فراہم ہوں گے اور پنجاب اور پنجابیوں کے غلبے سے بھی نجات مل جائے گی (چاہے اس کے بدلے میں جیسا کہ ہونا تھا سرداروں کی غلامی مل جائے) یہ تو تھے وہ منطقی دلائل جو بظاہر دیئے جاتے تھے۔ بباطن جو منصوبہ تھا اس کا اظہار میں اوپر کر چکا ہوں۔

اب موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ بلوچستان حکومت نے دیگر غیر مقامی ملازمین کے ساتھ ضلع ڈیرہ غازیخاں کے ملازم باشندگان کو بھی فارغ کر دیا ہے۔ دیگر اضلاع سے زیادہ متاثر ہونیوالا ضلع بھی یہی ہے۔ کیونکہ کثیر تعداد ملازمین کی انہی پر مشتمل ہے۔ اگر ضلع ہذا کو بلوچستان میں شامل کرانے کی کوشش کرنے والے سردار لوگ مخلص ہوتے اور ان کو ضلع کے عوام کی بدحالی اور بیروزگاری کا احساس ہوتا تو وہ بلوچستان حکومت پر زور دیتے اور اس غیر منصفانہ فیصلے پر تنقید کرتے اور اسے اس کے اس فیصلے پر عمل کرنے سے باز رکھتے۔ مگر ایسا نہیں ہوا اس کا مطلب واضح ہے کہ وہ صرف اپنے تسلط اور حکمرانی کو قائم رکھنے کی حد تک اس کے خواہاں ہیں، ورنہ عوام کی بہبود سے انکا کوئی سروکار نہیں۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اگر یہ فیصلہ پنجاب یا سندھ کی حکومت کرتی تو نام نہاد جمہوریت پسند عناصر اور بالخصوص جمہوریت نواز سردار شیر باز خان مزاری لٹھ لے کر پیچھے پڑ جاتے۔ مگر بلوچستان حکومت کے اس غیر عادلانہ فیصلے سے ان کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی۔ یہ کیسی جمہوریت نوازی ہے؟

میں نے معتبر ذرائع سے آگاہی حاصل کی ہے کہ اب پروگرام یہ ہے کہ ضلع ڈیرہ غازی خان کے کچھ مخصوص لوگوں کا نیا تقرر کرانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ سردار شیر باز خان صاحب کی جناب گورنر بلوچستان میر بزنجو صاحب کو دعوتِ طعام دینے کی اصل غرض بھی یہی بتائی جاتی ہے۔ نیز ان تقرریوں سے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش بھی کی جائے گی۔ کیونکہ جن مخصوص لوگوں کا تقرر کر لیا جائے گا۔ ان کے فرائض میں یہ فرض بھی شامل ہوگا کہ ضلع ڈیرہ غازی خان کو بلوچستان میں شامل کرانے کے لئے رائے عامہ ہموار کی جائے "یعنی دوسرے الفاظ میں یہ لوگ پروپیگنڈہ مشینری کا کام سرانجام دیں گے۔ تنخواہ سرکاری خزانے اور کام سرداروں کا کریں گے۔ بلوچستان سے جن غیر مقامی بالخصوص ضلع ڈیرہ غازیخان کے باشندوں کو نکالا گیا ہے۔ اس کی تمام تر ذمہ داری پنجاب حکومت پر ہوگی، مایوسی میں اضافہ ہوگا۔ ان نئی تقرریوں کا کریڈٹ حاصل ہوگا اور اس طرح درپردہ سازش کو عملی جامہ پہنانے کا موقع ان کو مل جائے گا۔

کاش مرکزی تعلیم و صوبائی رابطہ ان حقائق پر غور کر لیتے! اب بھی وقت ہے اگر ضلع ہذا کے عوام کی بے چینی کا سدِباب ہو جائے تو ان کی کوششیں کبھی بار آور نہیں ہو سکیں گی، پیپلز پارٹی توجہ کرے۔

کراچی

قانون کی خلاف ورزی سرمایہ دار کریں، جیل مزدور کاٹیں

محمد امین

تعمیراتی کمپنیوں کے مالکان مزدوروں کے جائز حقوق پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں، قانون کی کھلی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ جائز حقوق کے لیے اٹھنے والی آواز کو دبانے کے لیے برطرفیاں، جھوٹے مقدمات اور انتقامی کارروائیاں تیز کر دی گئی ہیں۔ لبعض مالکان کم سے کم اجرت بھی ادا نہیں کر رہے اور چند مالکان ہر ماہ اپنے ملازموں سے اتوار کے دن بھی زبردستی ڈیوٹی لیتے ہیں جس کی کوئی اجرت نہیں دیتے۔

ان مالکان نے مزدوروں کو بونس چھٹیاں، ڈبل اوورٹائم علاج، کرایہ آمد و رفت، کرایہ مکان، گریجویٹی اور دوسرے جائز حقوق سے مکمل طور پر محروم رکھا ہے۔ وہ اس "عوامی دور" میں بھی حقوق غصب کر رہے ہیں اور قانون کی دھجیاں اڑا رہے ہیں۔ ایک ایک پراجیکٹ چار سال میں مکمل ہوتا ہے لیکن اس کی تعمیر کرنے والے عارضی ہی تصور کیے جاتے ہیں اور جب آواز اٹھائی جائے تو جواب ملتا ہے کہ "تعمیرات پر کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا"، کیا تعمیرات کے مزدوروں کو آٹا سستا ملنے کا کوئی انتظام ہے؟ ان مظالم کے خلاف حکومت کی توجہ بار بار مبذول کرائی گئی۔ محکمہ لیبر کے افسران یا کارندے کسی پراجیکٹ پر جا کر مزدوروں سے نہیں پوچھتے کہ آپ لوگوں کو جائز حقوق ملتے ہیں یا نہیں۔ اس محکمے پر عوام کے کروڑوں روپے سالانہ خرچ آتے ہیں۔ مگر محکمہ درخواست وصول کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں کرتا۔ اس دوران اگر مزدور فاقہ کشی سے گھبرا کر بھاگ نہ جائے تو اسے جواب دے دیتے ہیں کہ ہمارا اختیار نہیں ہے تم لیبر کورٹ سے رجوع کرو۔ اس طرح مالکان محکمہ لیبر ویلفیئر کے تعاون سے مزدور کے جائز حقوق دبانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مزدور اپنا خون پسینہ ایک کر کے سرمایہ داروں کی تجوریاں بھرتے ہیں اور ایک ایک فیکٹری کی جگہ چھ چھ فیکٹریاں لگاتے ہیں مگر اپنی پوری زندگی نہایت بے کسی کے عالم میں گزارتے ہیں۔

آج کا مزدور یہ بات سمجھ چکا ہے کہ جنگ ظالم اور مظلوم کی ہے، جنگ اس نظام سے ہے۔ سرمایہ داروں کے مظالم نے مزدوروں کو شعور دیا ہے کہ لڑائی نوٹس پے یا بونس کی نہیں نہ زیادہ اجرت کی ہے۔ لڑائی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک یہ جابرانہ نظام ہمیشہ کے لیے ختم نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ اس نظام میں مزدور اپنا جائز حق کبھی نہیں لے سکتا جہاں قانون کی خلاف ورزی تو

سرمایہ دار کریں اور جیل مزدور کاٹیں۔

تعمیرات کے مزدور ملکی مفادات اور پاکستان کی سالمیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہڑتالوں، مظاہروں سے گریز کر رہے ہیں اور موجودہ حکومت سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ مالکان کو قانون کی پابندی پر مجبور کرے گی۔

گرفتاریوں کا مقصد

صنعتی امن

کو برباد کرنا ہے

الفتح رپورٹ

۷ر اکتوبر کو گندھارا انڈسٹریز ویلفیئر یونین کے جنرل سیکرٹری مسٹر الف یوخان کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ یاد رہے کہ گندھارا انڈسٹریز کی انتظامیہ اور یونین کا تنازعہ صنعتی عدالت میں زیرِ سماعت ہے۔ کانڈا والا ایمپلائز یونین کے صدر عبدالغفور اور جنرل سیکرٹری محمد زمان نے ایک مشترکہ اخباری بیان میں الف یوخان کی گرفتاری کی سخت مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس گرفتاری کا مقصد صنعتی امن برباد کرنا ہے۔ نوکر شاہی سرمایہ داروں سے گٹھ جوڑ کر کے ملک کی اقتصادی اور معاشی بحران کو شدید تر کرنا چاہتی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہمارا ملک ایک سنگین بحران سے دوچار ہے اور الف یوخان کی گرفتاری قومی مفاد کے سراسر منافی ہے۔ اس لیے ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ انہیں فوراً رہا کیا جائے۔

نوشہرو فیروز

ان گرفتاریوں نے

رہی سہی کسر پوری کر دی

—— : شاہد انور میمن : ——

تعلقہ نوشہرو فیروز میں گرفتاریوں کا سلسلہ ایک مرتبہ پھر شروع ہو گیا ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی ضلع نواب شاہ کی ورکنگ کمیٹی کے رکن عباس باغی اور تعلقہ نوشہرو فیروز کی پیپلز پارٹی کے سابق پبلسٹی سیکرٹری محمد ملوک جانوری کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ یہ گرفتاریاں دفعہ ۱۰۰، ۱۱ اور ۱۰۵ کے تحت عمل میں آئی ہیں۔ یاد رہے کہ چار ماہ پیشتر یہاں کے پرانے صحافی، مشہور مزدور اور ہاری ورکر، سابق جنرل سیکرٹری پاکستان پیپلز پارٹی نوشہرو فیروز جناب علی احمد میمن کو بھی ان ہی دفعات کے تحت پابندِ سلاسل کیا گیا تھا۔ علی احمد میمن کا قصور یہ تھا کہ وہ کھل کر مزدوروں اور کسانوں کی حمایت کرتے تھے۔ مظلوم طبقے کے حقوق کا تحفظ چاہتے تھے اور بدعنوان نوکر شاہی وڈیروں کی مخالفت کرتے تھے۔ یہی بات نوکر شاہی اور وڈیروں کی نظر میں "جرم" بن گئی۔ عباس باغی اور محمد ملوک جانوری کا بھی یہی قصور ہے۔

نوشہرو فیروز میں پاکستان پیپلز پارٹی کی جڑیں علی احمد میمن کی گرفتاری کے بعد ہی کمزور پڑ گئی تھیں۔ عوام یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ جس شخص نے پیپلز پارٹی کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ اپنے کاروبار کی پرواہ نہ کی اور پارٹی کے منشور کو گھر گھر پہنچایا۔ اس کے ساتھ جب اسی پارٹی کی حکومت ایسا سلوک کر سکتی ہے تو دوسروں کا کیا حال ہو گا۔ اب عباس باغی اور جانوری کی گرفتاریوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی ہے۔ پیپلز پارٹی کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور پارٹی کے عہدوں پر ایسے لوگ آ گئے ہیں جنہوں نے پیپلز پارٹی کے لیے کچھ نہیں کیا۔

سندھ ٹیکسٹائل ملز کی انتظامیہ

اپنے وعدے سے مکر گئی

— نمائندہ الفتح —

سندھ ٹیکسٹائل ورکرز یونین کے جنرل سیکرٹری احمد اللہ خان نے ایک اخباری بیان میں سندھ ٹیکسٹائل ملز کی انتظامیہ کے مزدور دشمن رویّہ کی سخت مذمت کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ جنوری ۱۹۷۲ء میں انتظامیہ اور یونین کا ایک معاہدہ ہوا تھا۔ جس میں انتظامیہ نے بونس دینے کا مطالبہ تسلیم کر لیا تھا لیکن اب انتظامیہ اپنے وعدے سے انحراف کر رہی ہے۔ اس نے ۷۲/۱۹۷۱ کی آمدنی خرچ اور منافع کی رقم ابھی تک نہیں بتائی۔ اس طرح سے بونس کی ادائیگی نہیں کرنا چاہتی۔ جب یونین نے اپنے مطالبے پر زیادہ زور دیا تو انتظامیہ نے ملز بند کر دینے کی دھمکی دی۔

جنرل سیکرٹری نے بتایا کہ یونین گزشتہ تین ماہ سے باہمی گفت و شنید کے ذریعے مسئلہ طے کرنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن انتظامیہ ہٹ دھرمی سے کام لے رہی ہے اور ۱۹ر ستمبر کو اس نے بونس دینے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ اخباری بیان میں کہا گیا ہے کہ انتظامیہ کے اس رویّہ کی وجہ سے مزدوروں میں بے چینی اور اضطراب پھیل رہا ہے۔

مطالبہ کیا گیا ہے کہ حکومت اور اربابِ اقتدار فوری طور پر مداخلت کریں۔



رجعت پسند کمیونسٹوں کو ہوّا بنا کر پیش کر رہے ہیں

آج کل ملک بھر میں ترقی پسند محبِ وطن لوگوں کو کمیونسٹ قرار دے کر ان کے خلاف ہرزہ سرائی کی جارہی ہے۔ چند بورژوا ترقی پسند اور اسلام پسند جماعتیں اس پروپیگنڈے میں آگے آگے ہیں۔ آیئے رجعت پسندوں کے اس پروپیگنڈے کا جواب دینے کے لئے تین سوالوں پر غور کریں۔

(۱) کمیونسٹ سے مراد کون سے لوگ ہیں؟

(۲) اُن کے مقاصد کیا ہیں۔؟

(۳) اُس کے محنت کشوں سے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔؟

"ایک کمیونسٹ کے اندر کشادہ ذہنی ہونی چاہیئے اور اُسے مخلص اور مستعد ہونا چاہیئے۔ اسے انقلاب کے مفادات کو اپنی ہی زندگی سمجھنا چاہیئے اور اپنے ذاتی مفادات کو انقلاب کے مفادات کا تابع رکھنا چاہیئے۔ اسے ہر وقت اور ہر جگہ صحیح اصول پر ثابت قدمی سے کاربند رہنا چاہیئے۔ اسے کسی فرد سے زیادہ پارٹی اور عوام کا خیال رکھنا چاہیئے اور اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ صرف اسی صورت میں اُسے کمیونسٹ شمار کیا جاسکتا ہے۔"

چیئرمین ماؤ کے مندرجہ بالا قول (اقتباس) سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ کمیونسٹ وہی شخص ہوتا ہے، جو اپنی ذات کو دوسروں پر یعنی عوام پر نچھاور کر دیتا ہے وہ دوسروں کی مدد کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ اس کے اقوال وافعال تمام عوام الناس کی حمایت میں ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ سچائی اور صداقت کا پاسدار ہوتا ہے۔ وہ عوام کے کام کے لئے اپنے آپ کو دل وجان سے وقف کر دیتا ہے اور خاموشی کے ساتھ جانفشانی سے کام کرتا ہے۔ یہ خاموشی اُس کے اصولوں میں سے ایک ہے۔ وہ نام نہاد ترقی پسندوں کی طرح شیخیاں نہیں بگھارتا ہے۔

اب ہمیں یہ معلوم ہوگیا کہ کمیونسٹ کیسے افراد کو کہتے ہیں لیکن ہمیں اُن کے مقاصد کا کچھ علم نہیں۔ مارکس اور اینگلز نے کمیونسٹ پارٹی کے منشور میں لکھا ہے: "محنت کشوں کی پارٹیوں کی طرح کمیونسٹوں کا فوری مقصد یہ ہوتا ہے کہ محنت کشوں کو بغیر کسی امتیاز کے ایک طبقے میں مربوط کیا جائے اور ان کے سیاسی شعور کو بلند کیا جائے۔ پھر بورژوا کی برتری کو ختم کیا جائے اور محنت کشوں کی سیاسی قوت کا غلبہ ہو۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ کمیونسٹ چند افراد کی بجائے عوام کی حکومت چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے وہ محنت کشوں میں سیاسی بیداری پیدا کرتے ہیں اور پھر ان کو جدوجہد کی ترغیب دیتے ہیں کہ چند افراد کی حکومت کا تختہ الٹ دیں۔ سرمایہ کو چند ہاتھوں میں مرکوز نہ ہونے دیں۔ کیونکہ وہ ایک سماجی چیز ہے جو ہر ایک کو حاصل ہونی چاہیئے۔ مارکس اور اینگلز نے اس نظریے کو یوں کہا ہے۔

"انفرادی ملکیت کا خاتمہ۔"

مارکس اور اینگلز نے کمیونسٹ پارٹی کے منشور میں "کمیونسٹ اور محنت کش" کے عنوان سے یہ کہا ہے۔

"کمیونسٹ محنت کش پارٹیوں سے علیحدہ کوئی پارٹی نہیں رکھتے وہ بحیثیت مجموعی کوئی علیحدہ مقصد نہیں رکھتے۔ ان کے کوئی پوشیدہ اصول نہیں ہوتے کہ جن سے محنت کشوں کی جدوجہد کا رُخ یا ہیئت تبدیل کی جاسکے۔ کمیونسٹ محنت کش پارٹیوں سے صرف اس جگہ علیحدہ ہوتے۔

(۱) وہ مختلف ملکوں میں محنت کشوں کی طبقاتی کش مکش بتاتے ہیں اور بغیر کسی قومیت کے تمام محنت کشوں کے مشترکہ مقصد کو سامنے لاتے ہیں۔

(۲) ارتقاء کے مختلف ادوار میں جو کش مکش، محنت کشوں اور بورژوا کے درمیان ہوتی ہے، وہ ہمیشہ اور ہر جگہ جدوجہد کے مقاصد کو ایک کرکے پیش کرتے ہیں۔

چنانچہ کمیونسٹ عملی طور پر ہر ملک کی محنت کشوں کی جماعت کا سب سے ترقی یافتہ اور مستحکم حصہ ہوتے ہیں جو مخالفین کے پروپیگنڈے کا توڑ کرتے ہیں اور مزدوروں اور کسانوں میں سیاسی شعور پیدا کرتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ یہ سب کچھ کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ نظریاتی طور پر، انہیں یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ جدوجہد کی راہ، حالات اور محنت کشوں کی ہونے والی کش مکش سے حاصل ہونے والے نتیجوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔

اس ساری بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کمیونسٹ محنت کشوں کا دوست ہے جو ان کی جدوجہد میں ایک نمایاں کردار انجام دیتا ہے۔ وہ ایک طرف تو محنت کشوں کو طبقاتی کش مکش کی تعلیم سے روشناس کراتا ہے تو دوسری طرف بورژوا طبقے کے پروپیگنڈے اور ان کے خلاف عملی طور پر لڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ وطن دشمنوں کی مخالفت کرتا ہے اور ان کی شرافت کا لبادہ اتار پھینکتا ہے تاکہ لوگ ان کی اصلیت سے آگاہ ہوسکیں۔ ان سب باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج جو لوگ پاکستان میں کمیونسٹوں کو ہوّا بنا کر پیش کر رہے ہیں وہ ملک کے دوست نہیں دشمن ہیں۔ کیونکہ ایک کمیونسٹ سے زیادہ ملک کا کوئی گہرا دوست نہیں ہوتا۔ چنانچہ ترقی پسند رسالوں کو اس پروپیگنڈے کا سختی سے نوٹس لینا چاہیئے تاکہ رائے عامہ کو غلط راہ پر نہ ڈالا جاسکے۔

(انور عاقل)

وادیٔ کاغان کا سفرِ نامہ پسند آیا

آپ کا رسالہ پڑھنے کا اتفاق اکثر وبیشتر ہوتا رہتا ہے۔ "الفتح" کسی تعارف یا تعریف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی مقبولیت عام ہے۔ ۳۱ اگست تا ۷ ستمبر کی "الفتح" کی اشاعت میں ڈاکٹر انیس عالم کا سفر نامہ بعنوان۔ "وادیٔ کاغان جاگیر دارانہ نظام میں جکڑی ہوئی ہے"۔ پڑھا اور خوب غور سے پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب کا طرزِ تحریر اتنا دلکش اور خوبصورت ہے کہ مضمون پورا ختم کیے بغیر چین نہیں آیا۔ غالباً یہ صرف اس لیے ہے کہ میرا تعلق وادیٔ کاغان کے علاقہ بالاکوٹ سے ہے۔

بالاکوٹ جو ایک اہم تاریخی مقام ہے، اس علاقے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ وادیٔ کاغان میں داخل ہونے سے پہلے بالاکوٹ کا قابلِ دید نظارہ اور شہدائے بالاکوٹ (۱۸۳۱) سید احمد شہید بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کے مزار سیاحوں کی نظروں سے کبھی بچ نہیں سکتے۔ ڈاکٹر صاحب نے وہاں کی قوموں کے بارے میں لکھا ہے۔ یہ درست ہے کہ وہاں سیّد خاندان اور سواتی خاندان خصوصیت کے حامل ہیں اور مزارعین میں گوجر خاندان شامل ہیں جو اکثر وبیشتر ظلم وستم کا نشانہ بنتے ہیں جس کا اندازہ ڈاکٹر صاحب نے سیر وتفریح کے دوران کر لیا ہوگا اس کے علاوہ وہاں دیگر قومیں بھی آباد ہیں۔

بالاکوٹ اور وادیٔ کاغان وناران کا سب سے بڑا مسئلہ آمد ورفت کا ہے۔ سڑکوں کا نظام اچھا نہیں ہے

کیونکہ سرد ترین علاقہ ہے، بارشیں ہوتی ہیں، برفباری ہوتی ہے جس سے سڑکیں بند ہو جاتی ہیں۔ اکثر اوقات حادثے ہوتے رہتے ہیں جو اس علاقہ کے لوگوں کے لیے بہت پریشان کن ہیں۔ گلگت ایجنسی کو جانے کا قدیم راستہ یہی ہے۔ زیادہ تر جیپ سروس کا انتظام ہے۔ حکومت کو آمد و رفت کے مسئلے پر توجہ دینی چاہیے لیکن اس علاقے کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے اکثر لوگ روزگار کی تلاش میں پاکستان کے دیگر شہروں میں چلے جاتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ آپ آئندہ بھی اس قسم کے مضامین شائع کرتے رہیں گے اور حکومت کی توجہ اس خوبصورت لیکن بدقسمت اور پسماندہ علاقے کی طرف دلائیں گے۔

وہاں پر خوانین اور سیدوں نے جو جاگیرداری نظام قائم کر رکھا ہے وہ غریب اور محنت کش عوام کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے اور وہ دن دور نہیں جب وہاں کے غریب عوام ان اونچے خاندانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے!

(شبیر احمد ولد مولوی محمد اسحاق — کراچی)

معراج کے خلاف

"نصرت" اور "مساوات" کا محاذ

میں پاکستان پیپلز پارٹی سانگھڑ کا ایک عام کارکن ہوں۔ مجھے یہ جان کر دکھ ہوا ہے کہ ہماری پارٹی کے اخبار "مساوات" اور "نصرت" وغیرہ نے انقلابی رہنما معراج محمد خان کے خلاف ایک شدید مہم شروع کر رکھی ہے۔ اس مہم کے باعث دائیں بازو کے اخبارات پیپلز پارٹی کے اندرونی خلفشار کو نمایاں کر کے خوب کیچڑ اچھال رہے ہیں۔ معراج محمد خان نے پارٹی کے لئے بے مثال کام کیا ہے۔ سانگھڑ میں جب بھٹو صاحب پر حملہ ہوا تو سارے جاگیردار اور وڈیرے بھاگ گئے تھے۔ صرف معراج نے مائیک سنبھالا اور برستی گولیوں میں جلسے سے خطاب کیا۔ معراج جیسا جیالا، دلیر اور مزدور کسانوں کا دوست رہنما آج تک پیپلز پارٹی میں پیدا نہیں ہوا اور نہ آئندہ اس کی امید ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ ایک ایسی حکومت میں معراج محمد خان کی کون سنے گا۔ جسے وڈیروں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے گھیر رکھا ہے۔ معراج کی آواز اس نقار خانے میں دب جاتی ہے۔ مگر جس دن یہ آواز بھی نہ رہی پیپلز پارٹی آدھی بھی نہ رہے گی۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جس دن معراج محمد خان پیپلز پارٹی سے نکل گیا ایک طوفان آجائے گا۔

میں آپ کے جریدے کی وساطت سے صدر بھٹو سے اپیل کرتا ہوں کہ بحیثیت چیئرمین مساوات لمیٹڈ، مساوات اور نصرت کے اس پروپیگنڈے کو بند کروائیں کیونکہ اس طرح پیپلز پارٹی کا جاگیردار گروپ مضبوط ہو رہا ہے۔

(اللہ ڈینو رند، سانگھڑ)

کچھ کنونشنی کم پی پیئے

نوکِ قلم سے زیادہ نڈھال ہیں

"الفتح" کے دونوں ماہانہ ایڈیشن، دیکھ کر ازحد مسرت ہوئی۔ آپ کا پرچہ جہاں قارئین کو عصرِ حاضر کے حالات و واقعات سے آگاہ کرتا ہے وہاں ان کے لیے سیاسی اتالیق یا رہنما کا درجہ رکھتا ہے۔ آپ کے مستقل کالم شذرات اور تجزیے لاریب خاصے کی چیز ہوتے ہیں۔ آپ کی ہر کاوش قابلِ داد ہے!

اس دفعہ کے ماہانہ پرچے میں آپ کا اداریہ، الفتح رپورٹ، بھگت سنگھ، چین نامہ اور شہاب صاحب کا انشائیہ قابلِ تعریف ہیں۔ خصوصاً شہاب صاحب نے دفتریت اور نوکر شاہی کے طبقاتی کردار کو طنزِ لطیف سے خوب آشکار کیا ہے۔

آپ نے پیپلز پارٹی کو خوب ابھارا اور نکھارا ہے اب اس کے کچھ طالع آزماؤں کا محاسبہ بھی آپ ہی کر رہے ہیں، یہ بڑی خدمت ہے۔ اگرچہ کچھ "کنونشنی" کم "پی پیئے" آپ کے نوکِ قلم سے زیادہ ہی نڈھال یا برہم ہو جاتے ہیں آپ ان کی پرواہ نہ کیجئے۔ خدارا ہمارے چیئرمین کو ان کے حصار اور نرغے سے نکالنے میں ہماری دستگیری کریں۔

ہم لوگ روزنامہ الفتح اور اس کے انگریزی ایڈیشن کا بڑی مدت سے انتظار کر رہے ہیں۔ ایک تجویز ہے کہ ماہانہ ایڈیشن موجودہ سائز سے نصف کر کے ڈائجسٹ سائز پر نکالیں۔ اس طرح جہاں پرچے کا گٹ اپ اور رعنائی سوا ہو جائے گی وہاں ہماری دیرینہ احتیاج برائے ڈائجسٹ کی تسکین بھی ہو جائے گی۔ امید ہے کہ آپ تجویز قبول فرمائیں گے!

(اکرم سرحدی - اسلام آباد)

بقیہ :- احوالِ واقعی

ملک کے بگڑتے ہوئے حالات کو سہارا بنا کر اپوزیشن پھر عوام کو مشتعل کر سکتی ہے۔ عوام ایک بار پھر بیوقوف نہ بن جائیں۔ دائیں بازو والے پھر کسی شخصیت کی نقاب اوڑھ کر عوام کے حقوق پر ڈاکہ نہ ڈال لیں۔ صدر بھٹو اور ان کے ساتھی عوام کے نام پر اور جمہوریت کے نام پر کبھی سوچیں، خیال کریں۔ کیا ان کی سی آئی ڈی، فیڈرل انٹیلی جینس اور دوسرے خفیہ ادارے انہیں یہ اطلاع نہیں دیتے کہ سینما گھروں میں جب "تصویری خبرنامہ"، چلتا ہے تو اب صدر بھٹو کی تصویر پر تالیاں نہیں بجتی ہیں بلکہ جنرل ٹکا خان کی تصویر پر بے ساختہ تالیاں پیٹی جاتی ہیں۔

بقیہ :- طبی سہولتوں کا فقدان

ہے۔ نواحی علاقوں کے سینکڑوں افراد روزانہ پندرہ پندرہ میل کا فاصلہ طے کر کے ان ہسپتالوں میں آتے ہیں۔ نواحی کالونیوں میں ابھی تک ہسپتالوں، ڈسپنسریوں، اسکولوں، کالجوں، کھیل کے میدانوں، بجلی، پانی، گندے پانی کی نکاسی کے منصوبے کو عملی جامہ نہیں پہنایا گیا۔ اسی وجہ سے ان علاقوں میں صحت اور صفائی کا مسئلہ روز بروز سنگین ہوتا جا رہا ہے۔ موسم کی تبدیلی کے ساتھ ہی ان بستیوں میں متعدی اور خطرناک بیماریاں پھیلتی ہیں اور ہر سال سینکڑوں افراد لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کراچی ایک ایسا علاقہ ہے جس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے علاوہ محکمۂ صحت اور بلدیاتی ادارے پر بھی عائد ہوتی ہے۔ لیکن بدقسمتی دیکھیے کہ اتنے سارے نگران کے ہوتے ہوئے بھی کراچی کے عوام طبی سہولت کے لیے ترستے اور تڑپتے ہیں۔

بقیہ :- اداریہ

معاشی جنگ کو تیز کرنے کا نہیں، بلکہ روٹی، کپڑے اور مکان پر قابض قوتوں سے مقابلہ کرنے کے لئے منظم ہونے کی گھڑی ہے۔

ان ایجنٹوں کی سرکوبی کرو جو مزدوروں، طالب علموں کسانوں اور مظلوم طبقات کے اتحاد میں نفاق پیدا کرنے کے لئے سرگرم ہیں۔ یہ خرکار قریبی دشمن ہیں۔ ان سے کارکن نجات حاصل کریں۔ کارکن قیادت کا منصب خود سنبھال لیں اور درمیانے طبقے کی قیادت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔

مزدوروں، کسانوں اور طالب علموں کا عظیم اتحاد قائم کرو۔

مزدور، کسان، طالب علم اتحاد زندہ باد!

خدا کی بستی کے بعد الفتح مطبوعات کی ایک اور پیش کش

شنگھائی کی عورتیں

چین کے جاگیردارانہ عہد کی مظلومیت اور بہمیت کی تصویر

ڈرامہ کے روپ میں

عظیم مصنف اور ڈرامہ نویس تورے زیتسہ ہوم کے قلم سے

جس کو

جمیل الدین عالی اور افضل صدیقی نے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے

اسٹیج ڈرامہ کی انوکھی تکنیک

عمدہ کاغذ — آفسٹ طباعت — قیمت تین روپے

ایجنٹ حضرات آج ہی اپنی مطلوبہ تعداد سے آگاہ کریں

ہفت روزہ الفتح کراچی

۸۰، ڈی، نرسری کمرشل ایریا پی۔ای۔سی۔ایچ۔ایس، کراچی ۲۹، فون: ۴۱۲۲۷۴